احمقوں کی جنّت

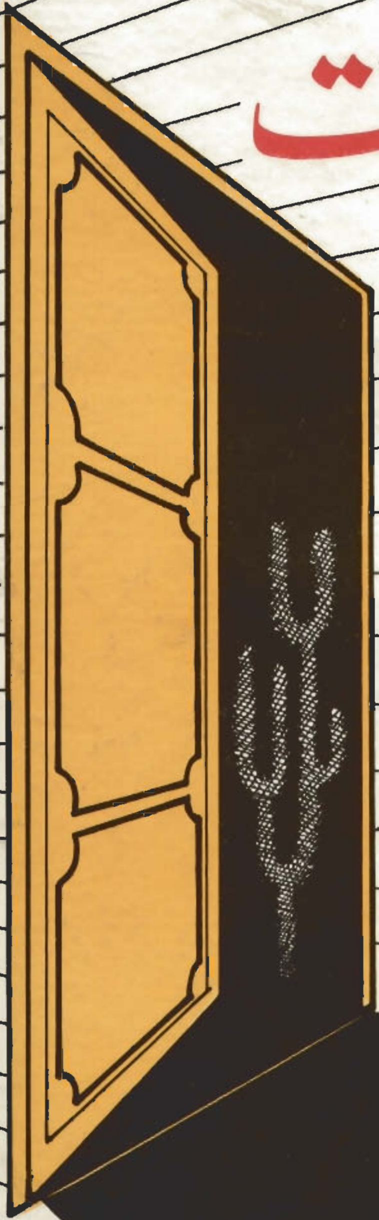

جی آر اعوَان

احمقوں کی جنّت

جی آر اعوان

گوہر سنز

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب :	احمقوں کی جنت
مصنف :	جی آر اعوان
طبع اول :	1999 ء
تعداد :	500
کمپوزنگ :	محمد اکرام الحق
طابع :	اے این اے پرنٹرز
قیمت :	-/110 روپے
اہتمام :	محمد احسن تہامی

گوہر سنز

رحمان مارکیٹ ، غزنی سٹریٹ

اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۳۱۱۱۹

ISBN 969 - 8370-05-6

ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

(اقبالؒ)

انتساب

اپنے پیارے ابا جی صوفی فضل کریم صاحب

کے نام

جنہوں نے ربوہ کے قصر خلافت میں

"احمدی ہم ہیں تم نہیں"

کا نعرہ حق بلند کیا۔

○○○

"مرزا قادیانی برطانوی اغراض کا روحانی بیٹا تھا۔
قادیان مرزائیت کی جائے پیدائش ' ربوہ اعصابی مرکز' تل ابیب تربیتی کیمپ ' لندن پناہ گاہ' ماسکو استاد اور واشنگٹن اس کا بینک ہے"۔

(شورش کاشمیریؒ)

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1۔	فکر و عمل کا تضاد	1
2_	الہامات کی رداؤں میں لپٹے ہوئے افراد کا اصل کردار	14
3_	روداد الفت	20
4_	غایت تحریر	23
5_	ویرانی سی ویرانی	27
6_	پینے پہ کوئی پابندی نہیں	32
7_	جونک نہیں لگتی پتھروں کو	37
8_	احمدی تو ہم ہیں	47
9_	چلتی پھرتی لائبریری	56
10_	بے وفا دوست سے کے ٹو سگریٹ اچھا	63
11_	احمقوں کی جنت	74
12_	حوریں	80
13_	غلماں	88
14_	نام نہاد صحابیوں کی افراط	93
15_	گھونگٹ کی ہوا	99
16_	ہلے ہوائے	107
17_	طلسمی صندوق	115
18_	کوتوال شہر	121
19_	منافقت کے چکنے چکنے پات	129

20_	ربوہ کا سالانہ میلہ	134
21_	کوفیوں کا شہر	139
22_	مرزائیت گزیدہ	144
23_	اقبال دشمنی	150
24_	یہاں سیلاب نہیں' آسمانی عذاب آئے گا	159
25_	قرآن کریم کے لفظ "ربوہ" کا تحقیقی مطالعہ	170

فکر و عمل کا تضاد

اللہ تعالیٰ کے آخری رسول محمد و احمد ﷺ کی غلامی کے صدقے نبی بننے کا دعویٰ کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کا اس غلامی پر ناز کرنے کی بجائے یہ نسبت ختم کر دینا اور خود محمد اور احمد (ﷺ) بن بیٹھنا دنیا کی تاریخ کا منفرد سانحہ ہے۔ جو مسلمانوں کے لئے ایک مستقل فتنہ ہے تو اس کی وجہ مرزا قادیانی کا دعویٰ کے بعد دلائل گھڑنے کا لا متناہی سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کے الفاظ تک کا تقدس اور سیاق و سباق ہی نظرانداز نہیں ہوا بلکہ الفاظ و معانی کی نئی دنیا بسائی گئی' لغات و اصطلاحات کا نیا جہان آباد ہوا' رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارکہ کو قبول اور مسترد کرنے کی بنیاد روایت اور درایت کا کوئی اصول نہیں بلکہ اس کا اپنے دعویٰ کے لئے کار آمد ٹھہرنا اس کے صحیح و غلط ہونے کا پیمانہ بن گیا۔ اخلاقیات کے بھی اپنے معیار بنائے گئے اس لئے مرزا قادیانی کے فکر و عمل کی پوری کائنات پیاز ثابت ہوئی چھلکے پہ چھلکا اتارتے جائیے نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ مثلاً" مرزا قادیانی نے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا لیکن کبھی تیرھویں صدی اور کبھی چودھویں صدی کے مجدد ہونے کی بات کی گئی(۱)۔ کبھی کہا وہ تیرھویں صدی کے پورے ہونے پر ظاہر ہونے والا مسیح ہے(۲)۔ یہ بھی کہا مثیل ہونے کا دعوی کیا ہے جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں(۳)۔ مگر ساری عمر اپنے نام کے ساتھ مسیح موعود لکھتے رہے۔ یہ بھی کہا کہ مسیح موعود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے۔ وہ تو نبی ہیں اور نبی اب آ نہیں سکتا اور امتی آپ ہو نہیں سکتے کہ نبی ہیں(۴) مگر جب مرزا نے خود نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو امتی بھی ٹھہرے(۵)۔ ظلی اور غیر تشریعی نبی(۶) اور تشریعی نبی ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا(۷)۔ دعویٰ یہ بھی ہے کہ میں جھوٹا ہوتا تو دعویٰ کے بعد ۲۳ سال تک زندہ نہ رہتا(۸)۔ لیکن جھوٹا دعویٰ کب کیا اس کا کوئی تعین نہیں(۹)۔ شاید اسی لئے کہا لفظ نبی کاٹا ہوا سمجھیں (۱۰)

جبکہ مرزا کے دوسرے جانشین کا کہنا یہ ہے کہ مرزا قادیانی نبوت کا فہم نہیں رکھتے تھے(۱۱)۔

مرزا قادیانی کی شخصیت کے بارے میں دو + دو = چار کی طرح یہی کلیہ بن سکتا ہے کہ دعویٰ پہلے اور دلائل بعد میں گھڑنے کی وجہ سے دعاوی اور نتائج میں ربط نہیں رہا۔ دعاوی بلند آہنگ اور نتائج اتنے ہی پست مرتب ہوئے۔ اس ضمن میں یہاں چند مثالیں اس لئے بھی ضروری ہیں کہ "احمقوں کی جنت" میں قادیانیوں کے صرف کردار کا ذکر ہے۔ نظری بحث سے قاری کو کردار سے پہلے قادیانیت کے فکر و نظر سے آگاہ ہونے میں مدد ملے گی۔

مرزا کے دعاوی و دلائل میں واضح فرق کی پہلی مثال کا مجمل ذکر شروع میں ہوا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد بزرگ ترین ہستی محمد و احمد ﷺ کی غلامی کے نتیجے میں منصب نبوت پر فائز ہونے کا دعویٰ کیا گیا(۱۲) اور اسی نسبت کو ختم کر دیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے غلام کی نسبت "سابقہ یا رواج کہہ کر ختم کی یا یہ سورہ الصف کی آیت مبارکہ نمبر۶ کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کا مصداق بننے کی کوشش میں ختم ہوئی کہ میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہو گا۔ بہرحال یہ نسبت ختم ہوئی۔ اور اپنے ہاتھوں ختم کی گئی پہلے مرزا قادیانی نے بروز مظہر، بعثت دوم وغیرہ کے حوالے سے (۱۳) بعد میں مرزا کے دوسرے جانشین مرزا بشیرالدین محمود نے حتمی فیصلہ دے دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق تو بس مرزا قادیانی ہے(۱۴) 1991ء میں مرزا کے چوتھے جانشین مرزا طاہر احمد کی سوانح حیات ایک برطانوی صحافی آئن ایڈمسن سے لکھوائی گئی A Man of God نامی اس کتاب میں شروع سے آخر تک مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر احمد ﷺ کی غلامی کا شرف حذف کر کے ہوا اور صرف احمد نام متعارف کرایا گیا۔

احمد ﷺ کی غلامی شرف انسانیت پر فائز ہونے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا دیگر کی غلامی سے نجات کی ضامن تھی۔ یہ ضمانت کیا ختم ہوئی مرزا قادیانی

سے ملک و قوم کی غلامی کے خاتمہ کے بارے میں سوچنے لکھنے اور کچھ کرنے کی صلاحیت ہی سلب ہو گئی۔

(2) یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ "آنحضرت ﷺ کی پیروی کمالات نبوت بخشتی ہے اور آپ کی روحانی توجہ نبی تراش ہے(۱۵)"۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور نبی تراش توجہ سے قیامت تک صرف ایک (وہ بھی خود ہی) نبی بننے کا نتیجہ نکالا گیا(۱۶)۔ اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کہ ہر ایک نبی کی شان مجھ میں پائی جائے اور ہر ایک نبی کی صفت کا میرے ذریعہ ظہور ہو"۔(۱۷)۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا قادیانی کو ایک مکمل انسان قرار دینے میں بھی تامل روا ہے(۱۸)۔ نبوت کے سلسلے میں یہ بھی دعویٰ ہے کہ نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی سیرت صدیقی کی کھلی ہے یعنی فنا فی الرسول پس جو شخص اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے ہاں آتا ہے اس پر ظلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے(۱۹)۔ اس حوالے سے اپنے رسول ہونے کا دعویٰ ایک صفحہ پہلے کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں سیرت صدیقی کی اس کھڑکی سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی اللہ کے پاس نہ آئے جبکہ وہی پہلے فنا فی الرسول ہیں جو رسول اللہ ﷺ میں فنا ہونے کے باوجود صدیق رہے۔ رسول نہیں بنے جیسے ایک قادیانی غلام' آقا میں فنا ہونے کے دعویٰ کے بعد خود فنا نہیں ہوا بلکہ جس میں فنا ہونے کا دعویٰ کیا وہی یعنی اپنا آقا بن بیٹھا۔ اور اس کے نتیجے میں غلام ہونے کے شرف سے محروم ہو گیا کہ ایسا دعویٰ غلامی کا نتیجہ ہی نہیں۔

(3) مرزا قادیانی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ "یہ بات واقعی سچ ہے کہ جو مسلمان ہیں یہ قرآن شریف کو بالکل نہیں سمجھتے اب خدا کا ارادہ ہے کہ صحیح معنی قرآن کے ظاہر کرے خدا نے مجھے اس لئے مامور کیا ہے اور میں اس کے الہام اور وحی سے قرآن شریف کو سمجھتا ہوں"(۲۰)۔ یہ دعویٰ 23 اکتوبر 1903ء کو کیا گیا جبکہ 28 مئی 1897ء کی ایک تحریر میں کہا گیا "میری تالیفات -------- اور بھی ہیں جو نہایت مفید ہیں جیسے رسالہ احکام القرآن اور اربعین فی علامات المقربین اور سراج منیر اور تفسیر کتاب

عزیز(۲۱) - دوسرے الفاظ میں ''الہام اور وحی سے قرآن شریف کو سمجھتا ہوں'' کے دعویٰ پر مبنی تفسیر تالیف ہو چکی تھی مگر یہ تفسیر آج تک منظر عام پر نہیں آ سکی جبکہ مرزا کو ''اسی لئے مامور'' کیا گیا۔

مرزا قادیانی کی جو تفسیر سامنے لائی گئی وہ باقاعدہ نہیں بلکہ دیگر تالیفات میں موجود مختلف آیات مبارکہ کی تفسیر ایک ترتیب سے جمع کر دی گئی اس میں زیادہ حصہ سورہ فاتحہ بلکہ اس کے آخری حصہ پر مشتمل ہے۔ اتفاق دیکھئے ''مرزا قادیانی کے قرآن کے صحیح معنی'' سے اختلاف مرزا کے جسمانی و روحانی جانشین مرزا بشیرالدین محمود نے کیا۔ ترجمہ کس کا صحیح ہے بحث اس سے نہیں غور طلب بات یہ ہے کہ مرزا محمود نے اپنے والد کا ترجمہ قرآن ''مامور کا ترجمہ'' نہیں سمجھا۔ مرزا قادیانی کی ''بیان فرمودہ'' تفسیر سورہ فاتحہ میں اس سورہ مبارکہ کی آخری آیت مجیدہ کا ترجمہ کئی بار ہوا اور ہر مرتبہ ایک بات مختلف انداز میں کی گئی۔ لیکن مرزا محمود نے کسی ایک انداز کو قبول نہیں کیا اور اپنی تفسیر صغیر و کبیر دونوں میں اس سے قطعی مختلف ترجمہ کیا جبکہ مرزا محمود کے داماد پیر معین الدین نے اپنے سسر کی تفسیر کی تلخیص ''مخزن معارف'' میں مرزا قادیانی کا ترجمہ لیا اور مرزا محمود کا ترک کر دیا۔

اب صحیح ترجمہ کا ایک نمونہ پیش ہے جس کے لئے مرزا قادیانی کا مامور ہونے کا دعویٰ ہے۔ سورہ اخلاص ' سورہ الفلق اور سورہ الناس کا ترجمہ یہ کیا گیا ''تم اے مسلمانو! نصاریٰ سے کہو کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے اور تم جو نصاریٰ کا فتنہ دیکھو گے اور مسیح موعود کے دشمنوں کا نشانہ بنو گے یوں دعا مانگا کرو کہ میں تمام مخلوق کے شر سے ------ خدا کی پناہ مانگتا ہوں ------ اور میں اندھیری رات کے شر سے جو عیسائیت کے فتنہ اور انکار مسیح موعود کے فتنہ کی رات ہے خدا کی پناہ مانگتا ہوں-----''(۲۲) یاد رہے ''بیان فرمودہ'' تفسیر سورہ فاتحہ میں اس ترجمہ کو جگہ نہیں مل سکی شاید اس کے مرتب اسکے صحیح معنی نہیں سمجھے!

مرزا نے ایک حدیث کا ترجمہ یہ کیا ہے ”کیا حدیث اما کم منکم کے یہی معنی نہیں کہ آنے والا عیسیٰ ‘ اے امتی لوگو! تم میں سے ہیں نہ کسی اور قوم سے(۲۴) اور یہ کہ ”صحیح بخاری میں آنے والے عیسیٰ کی نسبت صاف لکھا ہے کہ اما کم منکم یعنی اے امتیو! آنے والا عیسیٰ بھی صرف ایک امتی ہے نہ اور کچھ“ جبکہ صحیح بخاری میں یہ امام مہدی کے بارے میں لیکن مرزا قادیان نے حرف ”و“ اور اس کا ترجمہ حذف کر دیا مگر ایک سوال کے جواب خود ہی صحیح مفہوم واضح کر دیا ”حدیث میں آیا ہے کہ مسیح جو آنے والا ہے وہ دوسروں کے پیچھے نماز پڑھے گا“(۲۵)

اب ترجمہ کے ضمن میں مرزا قادیانی کے ایک الہام کے چند تراجم دیکھیں جو تمام مرزا قادیانی کے ہیں اس الہام کا انتخاب اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ اس کے تمام جملے قرآن مجید کی مختلف آیات میں معمولی تصرف کا نتیجہ ہیں۔ ایک سورہ تبت کی پہلی آیت ہے اور دوسری سورہ الاحقاف کی آیت نمبر 35 کا پہلا حصہ ہے دیگر کے لئے الانفال 8‘ 30‘ القصص 38‘ البقرہ 114‘ سورہ النساء 79 ایک نظر دیکھ لیں۔

مرزا قادیانی کا الہام یہ ہے **اذا یمکر الذی کفر‘ او قدی یاھامان لعلی اطلع علی الہ موسی و انی لاظنہ‘ من الکاذبین‘ تبت یدا ابی لھب و تب ما کان لہ ان یدخل فیھا الا خائفا و ما اصابک فمن اللہ الفتنۃ ھھنا فاصبر کما صبر الرالعزم۔**

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ ”اور جب تیرے ساتھ مکر کیا اس شخص نے جس نے کفر کی راہ اختیار کی اے ہامان! میرے لئے آگ روشن کر شاید کہ موسیٰ کے معبود کی اطلاع پا سکوں اور میں اس کو جھوٹوں میں خیال کرتا ہوں۔ ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور ٹوٹ گیا وہ خود اس کے لئے نہیں چاہئے تھا کہ داخل ہو اس میں مگر اس حالت میں کہ وہ خائف ہو اور جو تکلیف تجھ کو پہنچی ہے پس یہ اللہ تعالیٰ سے ہے یہ فتنہ ہے پس صبر کر جیسا کہ صبر کیا اولوالعزم لوگوں نے(۲۶)

اب مرزا قادیانی کے تراجم پڑھیں اور صحیح ترجمہ کے لئے مامور ہونے کی داد دیں!

(۱) وہ زمانہ یاد کر جب کہ مکفر تجھ پر تکفیر کا فتویٰ لگائے گا اور اپنے کسی حامی کو جس کا لوگوں پر اثر ہو سکتا ہو کہے کہ میرے لئے فتنہ کی آگ بھڑکاتا میں دیکھ لوں کہ یہ شخص جو موسیٰ کی طرح کلیم اللہ ہونے کا مدعی ہے خدا اس کا معاون ہے یا نہیں اور میں تو اسے جھوٹا خیال کرتا ہوں ۔ ابی لہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور آپ بھی ہلاک ہو گیا اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس میں دخل دیتا مگر ڈر ڈر کر اور جو رنج تجھے پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے(۲۷)

(۲) یاد کر جب مکفر نے بغرض کسی مکر کے اپنے رفیق کو کہا کہ کسی فتنہ یا آزمائش کی آگ بھڑکا تاکہ میں موسیٰ کے خدا پر یعنی اس شخص کے خدا پر مطلع ہو جاؤں کیونکہ وہ اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہے یا نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے یہ کسی واقعہ آئندہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو بصورت گزشتہ بیان کیا گیا ہے ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ بھی ہلاک ہوا اور اس کو لائق نہ تھا کہ اس کام میں بجز خائف و ترسادہ ہونے کے یونہی دلیری سے داخل ہو جاتا اور جو تجھ کو پہنچے تو وہ خدا کی طرف سے ہے یہ کسی شخص کے شر کی طرف اشارہ ہے جو بذریعہ تحریر یا بذریعہ کسی اور فعل کے اس سے ظہور میں آئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس جگہ فتنہ ہے بس صبر کر جیسے اولعزم لوگوں نے صبر کیا ہے(۲۸)

(۳) اور یاد کر وہ آنے والا زمانہ جب کہ ایک شخص تیرے پر تکفیر کا فتویٰ لگائے گا اور اپنے کسی ایسے شخص کو جس کے فتویٰ کا دنیا پر عام اثر ہوتا ہو کہے گا اے ہامان میرے لئے اس فتنہ کی آگ بھڑکا تا میں اس شخص کے خدا پر اطلاع پاؤں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے ہلاک ہو گئے دونوں ہاتھ ابی لہب کے اور وہ بھی ہو گیا (یعنی جس نے یہ فتویٰ لکھا یا لکھوایا) اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس معاملہ میں دخل دیتا مگر ڈرتے ڈرتے ---------

(۲۹) اور پھر فرمایا کہ اس فتویٰ تکفیر سے جو بھی تکلیف تجھے پہنچے گی وہ تو خدا کی طرف سے ہے یہ ایک فتنہ ہو گا بس صبر کرو جیسا کہ اوالعزم نبیوں نے صبر کیا(۳۰)

(۴) اور یاد کر وہ وقت جب تیرے پر ایک شخص سراسر مکر سے تکفیر کا فتویٰ دے گا ----- (۳۱) اور پھر فرمایا کہ وہ اپنے بزرگ ہامان کو کہے گا کہ اس تکفیر کی بنیاد تو ڈال کہ تیرا اثر لوگوں پر بہت ہے اور تو اپنے فتویٰ سے سب کو افروختہ کر سکتا ہے سو تو سب سے پہلے اس کفرنامہ پر مہر لگا تا سب علماء بھڑک اٹھیں اور تیری مہر دیکھ کر وہ بھی مہریں لگا دیں اور تاکہ میں دیکھوں کہ خدا اس شخص کے ساتھ ہے یا نہیں کیونکہ میں اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں (تب اس نے مہر لگا دی) ابولہب ہلاک ہو گیا اور اس کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے (ایک ہاتھ جس کے ساتھ تکفیر نامہ کو پکڑا اور دوسرا وہ ہاتھ جس کے ساتھ مہر لگائی یا تکفیر نامہ لکھا) اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس کام میں دخل دیتا مگر ڈرتے ڈرتے اور جو تجھے رنج پہنچے گا وہ تو خدا کی طرف سے ہے جب وہ ہامان تکفیر نامہ پر مہر لگا دے گا تو بڑا فتنہ برپا ہو گا بس تو صبر کر جیسا کہ اوالعزم نبیوں نے صبر کیا(۳۱)

(۵) یاد کر وہ زمانہ جب کہ ایک مولوی تجھ پر کفر کا فتویٰ لگائے گا اور اپنے کسی حامی کو جس کا لوگوں کو اثر ہو سکے گا کہے گا کہ میرے لئے اس فتنہ کی آگ بھڑکا یعنی ایسا کر اور اس قسم کا فتویٰ دے دے کہ تمام لوگ اس شخص کو کافر سمجھ لیں تاکہ میں دیکھوں کہ اس کا خدا سے کیا تعلق ہے یعنی یہ جو موسیٰ کی طرح اپنا کلیم اللہ ظاہر کرتا ہے۔ کیا خدا اس کا حامی ہے یا نہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے۔ ہلاک ہو گئے دونوں ہاتھ ابی لہب کے (جب کہ اس نے یہ فتویٰ لکھا) اور وہ آپ بھی ہلاک ہو گیا اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس کام میں دخل دیتا مگر ڈر ڈر کر اور جو رنج تجھے پہنچے گا وہ خدا

کی طرف سے ہے(۳۲)

ان تراجم کو تفسیری ترجمہ بھی قرار دیں تو بھی ان کے صحیح ہونے کی گنجائش نہیں۔ جہاں تک ''الہامی اور وحی پر مبنی تفسیر'' کا تعلق ہے تو مرزا قادیانی کے پہلے جانشین نورالدین' دوسرے جانشین مرزا بشیرالدین محمود اور لاہوری جماعت کے امیر محمد علی بھی اس سے مطمئن نہیں اور جابجا اس سے اختلاف کیا اس سلسلے میں تفصیلات حافظ عنایت اللہ اثری کی تصنیف ''مرزا صاحب قادیانی (اور) قرآن مجید سے نادانی'' میں دیکھی جا سکتی ہیں - یہاں نورالدین کے تفسیری نکات پر مشتمل ''حقائق الفرقان'' کا صرف ایک حوالہ کافی ہے - سورہ البقرہ کی آیت مبارکہ نمبر 259 کی تفسیر کے تحت ہے۔ ''حضرت صاحب یعنی مرزا قادیان - ناقل) سے میں نے ایک دفعہ اس آیت کے معنی دریافت کئے تو آپ نے فرمایا میں نے جناب الٰہی میں توجہ کی تو مجھ پر کھلا کہ وہ شخص واقعی مرگیا تھا عرض کیا پھر سو سال کے بعد اٹھنا کیا معنی؟ فرمایا کہ انبیاء کے مرنے کے بعد ایک حیات دی جاتی ہے ——— پھر عرض کیا وہ آیت کس طرح ہے؟ فرمایا کیا مردہ آیت نہیں ہو سکتا؟ ——— چونکہ میری طبیعت میں شرم اور ادب بہت تھا اس لئے میں نے یہ نہ پوچھا کہ **انظر الی طعامک و شرابک لم یتسنہ** کا کیا مطلب ہوا ہے۔ یہ بھی یاد رہے ''حقائق الفرقان'' کے پیش لفظ میں تذکرۃ المہدی ج ا ص ۲۴۴ کے حوالے سے درج ہے کہ مرزا قادیانی فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت مولوی نورالدین صاحب کی تفسیر قرآن آسمانی تفسیر ہے''۔

اب مرزا قادیانی کے دو تفسیری نکات درج ہیں

(الف) ''آیت **انا علی ذھاب بہ لقادرون** (۳۳) میں 1857ء کی طرف اشارہ ہے ——— جس کی نسبت خدا تعالیٰ آیت موصوفہ بالا میں فرماتا ہے کہ جب وہ زمانہ آئے گا تو قرآن زمین سے اٹھا لیا جائے گا''(۳۴)

(ب) ''اگر کوئی ہم سے سیکھے تو سارا قرآن ہمارے ذکر سے بھرا ہوا ہے''۔(۳۵)

''اگر کوئی ہم سے سیکھے'' کی شرط بھی خوب ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مرزا قادیانی

نے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ سے جو سلوک کیا اسے جاننے کے بعد بھی کوئی مرزا سے سیکھے گا تو یہی جانے گا کہ **ما یضل بہ الا الفاسقین** (البقرہ-۲۶) یعنی قرآن مجید سے گمراہی تو بس فاسقین ہی پا سکتے ہیں۔

مرزا قادیانی کے بلند دعاوی مگر پست نتائج کے اس تجزیے میں مرزا قادیانی کا اپنا کردار بھی واضح ہے۔ مرزا کے پیروکاروں کا اس سے متاثر ہونا لازمی امر تھا اسے پروفیسر محمد الیاس برنی سے جناب شفیق مرزا تک کئی اصحاب علم و فضل زیر بحث لائے ہیں تاکہ مسلمان اسے فتنہ سے محفوظ رہ سکیں۔ ہمارے دوست جی آر اعوان نے بھیرہ کے محلہ اسلامی باغ سے لاہور کے باغ گل بیگم تک کے سفر میں ربوہ اور چنیوٹ میں بھی قیام کیا(۳۶) اس قیام کے دوران جو دیکھا اسے طاہر رزاق صاحب کے اصرار پر سپرد قلم کیا۔ اس کار خیر میں میرا حصہ صرف یہ تھا کہ طاہر رزاق صاحب کو اعوان صاحب سے متعارف کرایا جس کی اس دنیا میں یہ جزا ملی کہ پہلے ہر باب کا خلاصہ سنا اور پھر مسودہ پڑھا اور ایڈٹ کیا۔ اعوان صاحب سے روز نامہ "پاکستان" میں متعارف ہوا وہ میرے نقش قدم پر "خبریں" سے "جنگ" پہنچے۔ دفتر اور اس سے باہر میری ان سے دوستی مثالی بنتی جا رہی ہے۔

"احمقوں کی جنت" کے تعارف کے سلسلے میں یہ لکھنا مبالغہ ہے نہ بے جا کہ اس سے مرزا قادیانی کے بارے میں قائم میرے اس کلیہ اور تاثر کو تقویت ملی ہے کہ دعاوی بلند مگر نتائج پست نکلے۔ قادیانیوں نے پاکستان میں اپنی آبادی کا نام ربوہ (بلند یا پہاڑی مقام) اس لئے رکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہما السلام کی جائے پناہ کو قرآن حمید نے ربوہ قرار دیا (المومنون-۵۰) اور مرزا بشیرالدین محمود نے اسے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے تشبیہ دی(۳۷) لیکن قادیانیوں کا کردار اپنی آبادی کے نام سے برعکس رہا۔ جہاں اصل احمدیوں یعنی مسلمانوں کو غیر احمدی اور احمد ﷺ سے تعلق نہ رکھنے والوں کو احمدی کہا گیا۔ قیام پاکستان میں ان لوگوں کا کیا کردار رہا یہ الگ موضوع ہے ان کے مردے آج بھی قادیان جانے کے منتظر

ہیں اس لئے اپنی نئی نسل کو "یہ ہے ہمارا ہندوستان" کا درس دیا جاتا رہا۔ مرزا طاہر کے بارے میں جو کتاب لکھوائی گئی اس میں مرزا طاہر کی نوجوانی کی ایک نظم ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

ربوہ میں ہے آج کل جاری نظام اپنا
ہے قادیاں لیکن ابدی مقام اپنا

یہ وہ قادیان ہے جس میں مرزا قادیانی نے مسیح موعود کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ کہہ کر ایک مینار تعمیر کرایا کہ احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مینار پر اترنے کا ذکر ہے(۳۸) یہی وہ منارہ ہے جسے دیکھنے کے لئے مرزا کے "صحابی" اور "ملنگ" دیوانے بنے ہوئے ہیں اور پھر ان ملنگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ملنگوں کا موازنہ کر کے مسلمانوں کو اشتعال دلایا جاتا ہے جب کہ علامہ اقبال اور مرزا قادیانی کی بیٹی مبارکہ بیگم سے کلام کا موازنہ کرنے والے قادیانی پروفیسر کا یہ کارنامہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا قادیانی کا نام لئے بغیر فرخ (مرزا کا تخلص) کو بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی اور اپنا مضمون فریب سے ایک سرکاری ماہنامہ میں چھپوا لیا جس میں خواجہ غلام فریدؒ کے بارے میں مغالطہ انگیزی سے کام لیا گیا جب کہ حقیقت جاننے کے لئے "مقابیس المجالس" کا مقدمہ دیکھنا ہی کافی ہو گا۔

اعوان صاحب نے درس گاہوں سے لے کر رہائش گاہوں اور "خلیفہ" کے لئے پروٹوکول کی تفصیل پر مبنی طبقاتی نظام کا تذکرہ بھی کیا ہے وہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ جماعت کچھ بھی ہو اس کا نبوت سے تعلق ہے نہ خلافت سے اور اس کا پورا نظام فریب پر قائم ہے۔

محمد انور طاہر

لاہور

حوالہ و حواشی

(۱) ازالتہ الاوھام ص ۶۵۳' ۱۵۴' تحفہ گولڑویہ ص ۱۰۲' ۱۰۳

(۲) ایضاً" ص ۱۸۵' ۱۸۶

(۳) ایضاً" ص ۱۹۰ بلکہ سب انبیاء علیہم السلام کے مثیل ہونے کا دعویٰ کیا (ازالہ ص ۲۵۳) لیکن کسی ایک نبی علیہ السلام کے مثیل ہونے کا شرف بھی حاصل ہوتا تو بھی نبوت کا دعویٰ نہ ہوتا کہ آیت میثاق کے تحت سب انبیاء علیہم السلام' ختم الرسل ﷺ کی پیروی کے پابند ہیں مثیل تو ان سے بھی بڑھ کرا!

(۴) ازالتہ الاوہام ص ۵۷۵ تا ۵۷۸

(۵) ایضاً" ص ۵۳۹

(۶) ایک غلطی کا ازالہ

(۷) اربعین نمبر ۴ ص ۶' ۷

(۸) ایضاً"

(۹) قاری نصیر احمد غزنوی نے اپنی تصنیف "اظہار حق - قادیانیت اپنے لٹریچر کے آئینے میں" اس سلسلے میں مرزا قادیانی کے ۲۶ مختلف اقوال کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱۰) مجموعہ اشتہارات ج ۱ ص ۳۱۲ تا ۳۱۴

(۱۱) حقیقت النبوت ' انوارالعلوم ج ۲ ص ۴۵۵' ۴۵۶ یہ کتاب مرزا محمود کی تصنیفات کا مجموعہ ہے

(۱۲) حقیقتہ الوحی ص ۲۸ ' ۲۷۴ ' کشتی نوح ص ۱۵

(۱۳) تحفہ گولڑویہ ص ۲۱' ۹۴ تا ۱۰۲ تذکرہ الشہادتین ۴۳' ۷۳' ایام صلح ۱۴۸' ۱۴۹ (حاشیہ)

(۱۴) انوار خلافت ص ۱۸ تا ۲۳

(۱۵) حقیقتہ الوحی ص ۹۷ حاشیہ

(۱۶) چشمہ معرفت ص ۸۲ ' حقیقتہ الوحی ص ۲۸ (حاشیہ) حقیقتہ النبوت انوارالعلوم جلد ۲ ص ۵۴۴

(۱۷) تتمہ حقیقتہ الوحی ص ۸۵

(۱۸) کیا شرف انسانیت کی انتہا پر فائز تمام شخصیات کا پرتو اور نمونہ ایسا ہو سکتا ہے جو اپنی تیسری شادی کے لئے گیارہ سالہ لڑکی محمدی بیگم کا رشتہ نہ ملنے پر اس کی پھوپھی کو خط لکھے کہ اپنے بھائی کو اور جگہ رشتے دینے سے روکے ورنہ اپنے بیٹے فضل احمد سے تمہاری بیٹی عزت بی بی کی مشروط طلاق لکھواؤں گا کہ جس روز محمدی بیگم کا کسی اور سے نکاح ہوا عزت بی بی کو تین طلاق ہیں اور واقعی طلاق دلوا دی اور تیسری شادی کی کوشش کی مخالفت پر دوسرے بیٹے سلطان احمد کو عاق کر دیا اور اشتہار دیا کہ جس روز محمدی بیگم کی دوسری جگہ شادی ہوئی اس نکاح کے دن سے سلطان احمد عاق اور محروم الارث ہو گا اور اس روز سے اس کی والدہ پر میری طرف سے طلاق ہے (مجموعہ اشتہارات ص ۲۱۹ تا ۲۲۱ ' سیرۃ المہدی ص ۲۲) اول

(۱۹) ایک غلطی کا ازالہ

(۲۰) ملفوظات ج ۶ ص ۱۶۷

(۲۱) نشان آسمانی ص ۴۳

(۲۲) تحفہ گولڑویہ ص ۷۷' ۷۸ روحانی خزائن ج ۱۷ ص ۲۲۰' ۲۲۱

(۲۳) براہین احمدیہ ضمیمہ ج ۵ ص ۱۳۲

(۲۴) ایضاً" ص ۱۸۲

(۲۵) فتاویٰ احمدیہ ج ۱ ص ۸۲ - یہ حوالہ محمدیہ پاکٹ بک ص ۵۹۶ سے لیا گیا ہے۔

(۲۶) احمدیہ تحریک ص ۹۸ از ملک محمد جعفر خان

(۲۷) تفسیر سورہ فاتحہ ص ۳۱۸' ۳۱۹

(۲۸) تذکرہ (مجموعہ الہامات) ص ۹۰

(۲۹) حذف کے لئے یہ علامت اصل میں اس طرح ہے

(۳۰) تذکرہ ص ۳۷۱

(۳۱) ایضاً" ص ۳۹۹

(۳۲) تحفہ گولڑویہ ص ۷۵ روحانی خزائن ج ۱۷ ص ۲۱۵

(۳۳) سورہ المومنون (۲۳)/۱۴

(۳۴) ازالتہ الاوہام ص ۲۲۷ حاشیہ

(۳۵) تفسیر سورہ فاتحہ ص ۳۱۹

(۳۶) اتفاق دیکھئے مرزا بشیر الدین محمود قادیان سے براستہ رتن باغ لاہور ربوہ پہنچے (اخبا الرحمت ۲۱ نومبر ۱۹۴۹ء)

(۳۷) خطبہ جمعہ بحوالہ قادیانی اخبار الرحمت لاہور جلد ا ص ا۔ ۲۱ نومبر ۱۹۴۹ء

۳۶ اور ۳۷ دونوں حوالے قادیانی مذہب (ایڈیشن ششم) کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں۔

(۳۸) خطبہ الہامیہ ص ۱۹، ۲۸

الہامات کی رداؤں میں لپٹے ہوئے افراد کا اصل کردار

قادیانی امت کا قول و فعل مرزا غلام احمد علیہ ما علیہ کے کشوف و الہامات اور "رویائے صادقہ" کی طرح بھان متی کی ایک پٹاری ہے اور ان میں اس قدر تضاد و تخالف بلکہ تناقص موجود ہے کہ اس کی کوئی تعبیر کرنا ممکن ہی نہیں۔ نام نہاد الہامات کی رداؤں میں لپٹی ہوئی "ذریت مبشرہ" نے ربوہ کی کلر اور شور زدہ سر زمین میں اپنے فکری و نظری بانجھ پن میں اضافہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے فارسی الاصل عجمی ذوق کی تسکین کے لئے بھی ایسی ایسی نئی راہیں تلاش کی ہے کہ خانوادہ نبوت کاذبہ کی ہر کلی ہی نہیں اس سے وابستگی اور پیوستگی کا اقرار کرنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد جسے بلا شبہ اس جماعت کا سواد اعظم کہنا چاہئے سدومیت کی ایسی نہج پر چلا ہے کہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا تعالیٰ نے عصمت نبوی ﷺ پر زبان طعن دراز کرنے کے نتیجے میں اہل ربوہ سے عصمت و کردار کا وہ گوہر بھی چھین لیا ہے جو ایک عام آدمی کے ماتھے کا جھومر ہوتا ہے کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ قادیانی امت کے بڑے تو چندے کے استحصالی نظام کو باقاعدہ بھتے کی شکل دے کر ہر سال اربوں روپیہ اکٹھا کر لیتے ہیں اس لئے وہ تو فراوانی دولت کے نشے میں بیکاری کے شغل کے طور پر یہ دھندہ اپنا لیتے ہیں لیکن وہ لوگ جنہیں مرزا غلام احمد کو نبی ماننے اور اپنے معاشرے سے کٹ کر ربوہ کے استحصالی نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے رہنا پڑتا ہے اور اپنی قوت لایموت میں سے بھی جبری بھتہ دینا پڑتا ہے وہ اگر اس عالم میں اپنے سربراہوں بلکہ گورو رجنیشوں کا اتباع نہ کریں تو کیا کریں!

جھوٹ، الزام تراشی، غیبت، دھوکہ دہی اور فریب وہ عناصر خمسہ ہیں جن سے قادیانیت کا خمیر اٹھایا گیا ہے اس لئے اگر اس سے کوئی اور چیز بر آمد ہو تو اس پر تعجب ہو گا۔ ہر وہ شخص جس نے چند سال ربوہ میں آنکھیں کھلی رکھ کر گزارے ہیں وہ اس

امر کی شہادت دے گا کہ ربوہ کی معاشرتی اور معاشی زندگی حسن بن صباح کی جعلی جنت کی طرح ظلی اور بروزی ہی نہیں بلکہ عین بہ عین اس کا بدل ہے۔ برادرم جی آر اعوان کو ربوہ کے افکار و نظریات سے کبھی کوئی علاقہ نہیں رہا لیکن انہیں گیارہ سال کا طویل عرصہ چناب کے اس پار گزارنے کا موقع ملا ہے اور ان کے مشاہدات اور تجربات بھی بالکل وہی ہیں جن کا ذکر راقم الحروف نے خاصی تفصیل کے ساتھ شہر سدوم میں کیا ہے اسے محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ مرزا غلام احمد کے اپنے زمانے میں بھی میں پیر سراج الحق افغانی نے ان کی پگڑی میں مرزا محمود احمد کے جنسی عصیان کے ایک واقعہ کے بارے میں تحریر لکھ کر محض اتفاقاً" ہی رکھ دی اور ازاں بعد اس اتفاق کی ایک جھلک اس وقت نظر آئی جب مولوی محمد علی نے یہ لکھا کہ مرزا محمود احمد پر الزام تو ثابت تھا مگر ہم نے اسے شبہ کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ اسے مکافات عمل کہئے یا ستم ظریفی ء حالات کہ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسی کتمان حق کی پاداش میں خود مولوی محمد علی اور ان کے اہل خانہ کو قادیان سے دربدر ہونا پڑا۔ اس کے بعد عبدالکریم اور محمد زاہد المعروف مباہلہ والوں نے اپنی بہن سکینہ بیگم زوجہ آنجہانی مرزا عبدالحق ایڈووکیٹ سرگودھا سے ہونے والی زیادتی پر مرزا محمود احمد کی پاکبازی کی حقیقت کھولنے کے لئے باقاعدہ ایک اخبار "مباہلہ" نکالا۔ پھر فخرالدین ملتانی نے اسی صورت حال سے تنگ آ کر قادیان کے در و دیوار پر "فحش کا مرکز" کی سرخی جما کر اشتہارات لگائے اور اس کے نتیجے میں اسے اپنی جان بھی دینا پڑی۔ حکیم عبدالعزیز نے بھی یہی راہ اپنائی' حقیقت پسند پارٹی کے جنرل سیکرٹری صلاح الدین نے اپنی بہن روزی اور ڈیزی سے ہونے والی زیادتی پر ہاہا کار مچائی "خالد احمدیت" عبدالرحمن خادم مصنف "احمدیہ پاکٹ بک" کے بھائی عطاء الرحمن نے اپنی کتاب "ربوہ کا مذہبی آمر" میں ایسے ہی خونچکاں حقائق کی نشاندہی کرتے ہوئے ایسے ایسے انکشافات کئے کہ قادیانی خلفاء کا سارا بھرم خاک میں رل کر رہ گیا۔ انہی کے دوسرے بھائی عزیزالرحمن نے سینکڑوں پمفلٹ لکھ کر مرزا محمود احمد اور ان کے ہم مشربوں کے قائم کردہ دجالی نظام کی قلعی کھول کر رکھ دی۔

مگر وہ اپنی پرانی تطہیر ذہنی کی بنا پر مرزا غلام احمد کو اب بھی مجدد مسیح موعود اور پتہ نہیں کیا کیا سمجھتے ہیں۔ مگر اس کی جنسی انارکی کے بارے میں کوئی مفاہمت کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بشیر احمد مصری جو مولوی عبدالرحمٰن مصری کے بیٹے تھے اور جنہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر یہ تحریر دی تھی کہ مرزا محمود احمد نے ان سے "فعل بد" کا ارتکاب کیا تھا آخری عمر تک اپنے اس موقف پر ڈٹے رہے۔ اور قادیانی امت کے چوتھے گورو مرزا طاہر احمد جب لنڈن گئے تو انہوں نے باقاعدہ ایک پمفلٹ چھاپ کر انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ یہ پمفلٹ میرے پاس بھی موجود ہے جسے جمعیت اہل حدیث نے لنڈن سے از سر نو شائع بھی کر دیا ہے جب کہ اس کی تفصیلات تو "لولاک" فیصل آباد میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ جس میں جناب بشیر احمد مصری نے مرزا طاہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جناب علماء کو چیلنج کرنے کی بجائے ہم سے مباہلہ کریں جو آپ کے گھر کے بھیدی ہیں۔ مگر مرزا طاہر احمد اپنے دادا کی سنت کے مطابق راہ فرار اختیار کر گئے کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ ان کے سامنے آنے سے قادیان اور ربوہ کی روحانی شکار گاہ کے ایسے ایسے مناظر سامنے آئیں گے جنہیں عبدالرحمٰن قادیانی کے بیٹے عبدالرزاق مہتہ کا کمزور قلم بیان کرنے سے عاجز رہ گیا۔ بھائی عبدالرزاق مہتہ تو خیر بڑھاپے میں یہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں تھے یہاں تو عصیان کا طوفان اپنی شدت میں اتنا زیادہ ہے کہ اس کو بیان کرنے سے تو "ڈی ایچ لارنس اور جان رائل اسکاٹ" کا قلم بھی عاجز اور بے بس ہو جاتا ہے۔ جی آر اعوان نے تو ان لوگوں کی بڑی تعداد کو جو روحانیت کے چکر میں ان دلدادگان رومانیت کے ہاتھوں سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تھے شاید دیکھا تک نہیں لیکن وہ بھی یہی بات کہتے ہیں تو پھر اسے محض یہ کہہ کر رد کر دینا ممکن نہیں کہ یہ سب مخالفین کی کارستانی ہے یہاں تو اپنے اور بیگانے سب متفق ہیں اس لئے یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے اور ایسا مشاہدہ اور تجربہ ہے جسے کوئی دلیل باطل نہیں کر سکتی۔ جی آر اعوان نے ربوہ کی معاشی و معاشرتی زندگی کی جو جھلک دکھائی ہے وہ ایک ایسا ناگزیر کام ہے جس سے اب تک صرف نظر کیا جاتا رہا ہے اس

اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی یہ نگارشات بہت بڑے خلا کو پورا کرتی ہیں ان کی یہ کتاب امت مسلمہ کے ہر طبقہ میں ہی ذوق و شوق سے نہیں پڑھی جائے گی بلکہ ربوہ کی سنگلاخ زمینوں میں بھی یہ اپنا اثر چھوڑے گی اور ماہرین نفسیات کے لئے بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ منور احمد انیس قادیانی نے ملائشیا کے نائب وزیر اعظم سے سدومیت کا شوق پورا کرنے کا پولیس کے سامنے جس طرح اقرار کیا اور اسے بی بی سی نے ہوا کے دوش پر کرہ ارض پر بسنے والے اربوں لوگوں تک جس انداز میں پہنچا دیا ہے قادیانی شاید اسے بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے الہام "میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا" کی تکمیل کا ہی پہلو قرار دیں گے۔ لیکن یہ راز اب طشت از بام ہوتا جا رہا ہے کہ قادیان اور اس کے بعد ربوہ میں جتنا بدترین استحصالی نظام قائم ہوا ہے اس نے اس جماعت کے نام نہاد سربراہوں کو تو خدمت دین اور خدمت قرآن کے نام پر اکھٹے کیے گئے چندوں سے حاصل ہونے والے اربوں روپے سے اندرون و بیرون ملک گلچھڑے اڑانے کے لئے کھلا چھوڑا ہوا ہے لیکن عام "احمدی" جو اپنے مخصوص عقائد و نظریات اور اس میں کیے جانے والے غلو و اطراء اور تشدد کی وجہ سے اپنی برادری اور ماحول سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے شہر میں جہاں روزگار کے کوئی متبادل ذرائع موجود نہیں وہاں وہ مرزا غلام احمد کے خاندان کو جبری بھتہ دینے پر بھی مجبور ہوتے ہیں اور ان کی چاکری کرنے پر بھی۔ کیونکہ اگر وہ وہاں پر قائم جبر و تشدد کے استحصالی نظام کے خلاف آواز احتجاج بلند کریں تو کرایہ پر رہنے والوں کو تو درکنار وہاں مالکان مکان کو بھی چلتا کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ صدر انجمن احمدیہ ربوہ سے صرف "لیز" پر زمین حاصل کر سکتے ہیں۔ پہلے تو اس زمین کی رجسٹری بھی "لیز ہولڈرز" کے نام نہیں ہوتی تھی گو اب یہ سلسلہ تو کسی حد تک شروع ہو گیا ہے لیکن حکومتی ٹیکس کے اربوں روپے خانوادہ نبوت کاذبہ نے جس طرح "ڈکارے" ہیں اس کا ابھی تک کوئی حساب نہیں لگایا گیا۔ ربوہ کی زمین "کراؤن لینڈ ایکٹ" کے تحت "علامتی قیمت" پر صدر انجمن احمدیہ ربوہ کو دی گئی تھی لیکن اسے لاکھوں روپے مرلہ کر

حساب سے مریدوں کو بیچ کر جس طرح اربوں روپے کمائے گئے ہیں یہ استحصال کی بدترین مثال ہے اور اس کا حکومت کو ازالہ کرنا چاہئے اور نہ صرف رجسٹری کے ہضم شدہ ٹیکس ان لوگوں سے وصول کرنے چاہئیں بلکہ اس "لیز" کو بھی فوراً منسوخ کر دینا چاہئے۔

قادیان سے تو مولوی محمد علی ' خواجہ کمال الدین اور دوسرے قریبی لوگوں کو وہاں کے "چھٹ بھیئیوں" نے نکلنے پر مجبور کر کے ۲۲ سالہ مرزا محمود احمد کو ایک ایسی عمر میں مرزا غلام احمد کی "گدی" پر بٹھانے کی کوشش کی جو دینی جماعتوں کی سربراہی کے لئے کسی طرح مناسب ہی نہیں۔ اس کے بعد مرزا محمود نے بھی جماعت کو "ھوالناصر" لکھنے کی تلقین کر کے اپنے بڑے بیٹے مرزا ناصر احمد کی تخت نشینی کی راہ ہموار کی اور مرزا رفیع احمد اپنے تمام خضوع و خشوع اور درسوں سمیت سوتیلا ہونے کی وجہ سے اس گدی کے قریب بھی نہ پھٹک سکے۔ حکیم نورالدین کے بیٹے میاں عبدالمنان کو پہلے ہی جماعت سے نکال کر راستے کا یہ پتھر بھی ہٹا دیا گیا تھا۔ اور ایک مرتبہ جب فالج کے انتہائی کربناک لمحات میں مرزا محمود احمد نے میاں عبدالمنان کو معافی دینے کا ارادہ کیا اور اس کا باقاعدہ جلسہ سالانہ کے موقع پر اعلان کرنے کا پروگرام بھی بنایا تو مرزا ناصر احمد نے پستول تان کر کہا۔

"ابا حضور ایسا ہرگز نہ کرنا ورنہ ـــــــــ"

اور پھر مرزا محمود احمد اس سے رک گئے۔ کیونکہ آخر یہ سارا ڈرامہ بھی تو انہوں نے مرزا ناصر احمد کو لانے کے لئے ہی رچایا تھا۔ مرزا ناصر احمد نے تخت خلافت پر متمکن ہو کر مرزا رفیع اور اس کے یمین و یسار میں رہنے والے لوگوں پر ظلم کی انتہا کر دی تو مرزا طاہر نے فوراً حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مرزا رفیع سے اپنے تعلقات توڑ لئے اور مرزا ناصر احمد کے بیٹے مرزا لقمان کو اپنی اکلوتی بیٹی دوسری شادی کے لئے دے کر خاندان میں اپنی پوزیشن مضبوط کر لی اور جب مرزا ناصر احمد اپنے بیٹے مرزا لقمان کے دام میں آنے والی "طاہرہ خان" سے راہ و رسم نبھانے اور اپنی مردہ رگوں میں جوانی کا

خون دوڑانے کی کوششوں میں ناکام ہوئے اور خدا تعالیٰ کی گرفت میں آکر "زرگباش" ہوئے تو مرزا طاہر احمد نے خاندان میں اپنی مضبوط پوزیشن کا فائدہ اٹھا کر خلافت پر قبضہ جما لیا۔ اب "ایم جی احمد" کے حق میں پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور توقع ہے کہ اگر کوئی غیر معمولی تبدیلی نہ ہوئی تو "خلافت" کا ہما اس کے سر پر بیٹھے گا۔ اس کے بعد بھی قادیانی امت یہی "ڈگڈگی" بجاتی رہے گی کہ "یہ خلافت" ہے گدی نہیں اور امر واقع یہ ہے کہ یہ گدی سے بھی دو قدم آگے رہنے والی "گدھی" ہے۔

شفیق مرزا لاہور

روداد الفت

میو ہسپتال لاہور کی غلام گردشوں میں آج بھی میری اور جی آر اعوان کی دوستی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ۱۹ برس قبل ہماری پہلی ملاقات ہسپتال کے اینٹی بائیوٹک اور اینٹی سیپٹک ادویہ کے مشک زدہ ماحول میں اس وقت ہوئی جب ہم دونوں وہاں ملازم تھے۔ ایک شفیق اور نستعلیق انسان سے ملاقات ہوتے ہی ہماری دوستی ہو گئی۔ یوں شیر و شکر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے گھریلو' دفتری' مالی اور سماجی حالات ایک جیسے تھے۔

اتنی طویل دوستی میں جو مشاہدہ میں نے کیا اس کے مطابق اعوان صاحب بڑے مرنجاں مرنج اور ہمہ صفت انسان ہیں۔ خود مصائب کے گرداب میں گھر کر بھی دوسروں کو کنارے لگانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کمٹمنٹ کا یہ عالم ہے جو وعدہ کریں اسے ایفا کرنا جزو زندگی سمجھتے ہیں۔

اعوان صاحب لاہور میں پیدا ہوئے۔ پرورش اور ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر بھیرہ ضلع سرگودھا کے محلہ اسلامی باغ میں پائی۔ افتاد طبع کا یہ عالم ہے پرائمری تعلیم کے دوران موصوف نے چند دن بھی کسی ایک سکول میں ٹک کر نہیں گزارے کبھی شوکت اسلامیہ سکول میں ہیں تو کبھی ماسٹر سعید کے مدرسے میں' آج چڑی چوگ سکول میں گئے ہیں تو کل اپنے تایا حاجی محمد حیات کے سکول علی پور سیداں میں براجمان ہیں۔ اپنے سرکاری ملازم والد محترم کے ساتھ مختلف شہروں میں بھی رہے اس دوران سلانوالی اور ساہیوال ضلع سرگودھا کے علاوہ لاہور کے کوٹ خواجہ سعید کے سکول میں بھی تختیاں لکھتے رہے۔ لیکن پرائمری تعلیم کا اصل' طویل اور نتیجہ خیز دور انہوں نے ضیائے امت پیر کرم شاہ کے سکول محمدیہ غوثیہ پرائمری سکول میں ملک نذیر اور صوفی خدا بخش کے زیر تدریس گزارا۔ آپ نے اسی سکول سے مارچ ۱۹۶۵ء کو پانچویں جماعت

پاس کی۔

اعوان صاحب کے والد صاحب کو سرکاری و نجی ملازمت خاص طور پر "کلرکی" بالکل پسند نہیں تھی۔ اسی لئے انہوں نے ۱۹۷۳ء میں ریٹائرمنٹ سے قبل ہی چنیوٹ میں سیمنٹ کی ایجنسی لے کر کاروبار شروع کر دیا جو سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے "فضل و کرم" سے ۱۹۷۸ء میں کم سنی کے عالم میں ہی دم توڑ گیا۔ ناچار اعوان صاحب کو ملازمت تلاش کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں وہ اپریل ۱۹۷۹ء کو لاہور کے باغ گل بیگم میں آ پہنچے اور حالات نے آپ کو میو ہسپتال کا جونیئر کلرک بنوا دیا۔ لیکن آپ نے والد کی نصیحت و وصیت کے مطابق خدا کی طرف سے موقع ملتے ہی "کلرکی" چھوڑ دی۔ ۱۹۸۱ء میں آپ نے حضرت یونس خان آفریدی ڈبل ایم اے۔ ایل ایل بی' ایف آر جی ایس ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ سے بیعت کر لی۔ میں آفریدی صاحب کا مرید تو نہیں تاہم عقیدت مند ضرور رہا ہوں۔ انہیں کے حکم پر ہم دونوں نے ایران کے خانہ فرہنگ مال روڈ پر فارسی کے کورس میں داخلہ لیا۔ کورس کی تکمیل کے بعد جی آر اعوان نے تو ایم اے اردو کر لیا جو میں چاہنے کے باوجود نہیں کر سکا۔ ایک دفعہ آفریدی صاحب نے قلندرانہ ترنگ میں کہا "اعوان صاحب آپ صحافی کیوں نہیں بن جاتے" عرض کی "حضرت وہ کیسے میرا تو اس پیشے سے دور کا بھی واسطہ نہیں" فرمایا "ہم نے کہا ہے بن جائیں"۔ بس ادھر آفریدی صاحب کے منہ سے بات نکلی سوئے اتفاق ادھر ڈان اخبار کے سکندر لالی نے اعوان صاحب کو سیارہ ڈائجسٹ میں جز وقتی پروف ریڈر بننے کے لئے بھیج دیا۔ آپ یہاں آئے تو پروف ریڈر کے بجائے مصنف بن کر اولیائے کرام کی چار جلدیں لکھ ڈالیں۔ اور دسمبر ۱۹۸۹ء تک علی سفیان آفاقی اور ندیم اہل کی ادارت میں کام کرتے رہے۔

آپ نے آغا شورش کاشمیری کی تمام کتب پڑھی کیا از بر کر رکھی ہیں یہ انہی کا اعجاز ہے کہ جب آپ کوئے صحافت میں آئے تو امروز' اجالا' چار دیواری' حکایت' سیارہ ڈائجسٹ' زندگی' مشرق' نوائے وقت میں لکھتے وقت انہیں کوئی دشواری نہیں

ہوئی۔ جون ۱۹۹۰ء میں روزانہ صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا اور چند دن نوائے وقت اور ایک سال مشرق میں گزارا۔ پھر پاکستان اور خبریں سے ہوتے ہوئے روز نامہ جنگ آ پہنچے اور تادم تحریر یہیں پر ڈیرے ڈالے بیٹھے ہیں۔

اعوان صاحب نے "احمقوں کی جنت" لکھنی شروع کی تو میں ڈر گیا انہیں روکا اور کہا بھائی مرزائی بڑے ظالم لوگ ہیں آپ اپنے بچوں کے تنہا کفیل اور وکیل ہیں آپ کو کچھ ہو گیا تو ان کا کون والی وارث ہو گا"۔ اس پر انہوں نے کہا "اگر اسی طرح مرنا لکھا ہے تو پھر ڈرنا کیسا"۔ بہرحال انہوں نے کتاب لکھ ڈالی جسے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوا اعوان صاحب نے کتاب لکھ کر کمال کیا ہے نہ لکھتے تو ملال ہوتا۔

محمد اشرف

ہارٹ میڈیکس جیل روڈ لاہور

۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۸ء

غایت تحریر

ہر شخص کے ماضی میں یادوں کا ایک جہاں آباد ہوتا ہے۔ ذہن کا کمپیوٹر آن ہوتے ہی بیتے دنوں کا لمحہ لمحہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ میرے ایام رفتہ بھی یادوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بے شمار تلخ و شیریں یادیں بھلائے نہیں بھولتیں۔ پھر قدرت نے انتہائی کمال کا حافظہ دیا ہے کہ اک ذرا غور کی دیر ہے گئے دنوں کی ہر بات یوں یاد آنے لگتی ہے جیسے مسافت سمٹ گئی ہو اور گزرا زمانہ لوٹ آیا ہو۔ بچپن کی یادیں تو ویسے بھی لاشعور کے نہاں خانوں میں ایسے جاگزیں ہوتی ہیں کہ انسان زندگی میں جب بھی خواب دیکھتا ہے 'تو خود کو اسی گھر میں دیکھتا ہے' جہاں اس نے بچپن گزارا ہوتا ہے۔

میرا بچپن اور لڑکپن کفر کی بستی "مرزائیل" میں گزرا جسے ربوہ کہا جاتا ہے۔ مرزائیل اور یہودیوں میں ہر اعتبار سے اس قدر مماثلت ہے کہ ربوہ کو اسرائیل کے ہم وزن مرزائیل کہنا انتہائی موزوں لگتا ہے تاہم کتاب کے نام "احمقوں کی جنت" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلمان جنت کے لئے اعمال' اوصاف اور افعال کو باکمال بناتا ہے جب کہ مرزائی پیغمبر کی جنت کے ٹکٹ کے خواہشمند کو اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد' کے ایک چوتھائی حصہ کے برابر رقم جماعت کو دینا پڑتی ہے۔ لہٰذا اعمال کی بجائے مال سے جنت حاصل کرنے والوں کے شہر کو "احمقوں کی جنت" ہی کہا جا سکتا ہے۔ ویسے کتاب کے آخر میں ڈاکٹر سید اعزازالحسن شاہ کا تحقیقی مضمون ربوہ کے نام کے متعلق بے شمار وضاحتوں کا حامل ہے جس کے مطابق مرزائیوں کے اس شہر کو ربوہ کے علاوہ کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں میرے والد گرامی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں ربوہ تبدیل ہوئے تو ہمیں اپریل ۱۹۶۵ء سے اگست ۱۹۶۹ء تک ربوہ میں رہنا پڑا۔ بعد ازاں اگرچہ

قیام چنیوٹ میں رہا' تاہم تعلیمی تعلق کے حوالے سے دسمبر ۱۹۷۵ء تک مرزائیل سے ہی وابستگی رہی۔ اس دوران وہاں کی شہری' مخصوص سماجی زندگی اور مرزائی روایات کے بے شمار مشاہدات سامنے آئے۔

مرزائی قوم ایک جھوٹے نبی کی امت ہونے کے باعث مسلمانوں کے لئے جس قدر ناپسندیدہ اور مکروہ ہے' اس سے کہیں زیادہ ان کی زندگی میں پھیلے ہوئے اخلاقی اور سماجی طاعون کو دیکھ کر سر چکراتا اور ذہن سوچتا ہے کہ یہ لوگ ہیں کیا اور خود کو پیش کیا کرتے ہیں۔ اخلاق کی چادر اوڑھے یہ گروہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر خصائل کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

قیام ربوہ کے دوران بے شمار مرزائیوں سے ملاقات ہوئی۔ کئی دوست بنے' لاتعداد کلاس فیلو بھی تھے۔ ان کے مذہبی اجتماعات بھی دیکھے۔ کئی مرزائی بے زاروں سے مرزائی امت کے ارباب حل و عقد کی داخلی زندگی کے رنگین و سادہ قصے بھی سنے۔ "جنت و دوزخ" اور "حور و غلمان" کی کہانیاں بھی معلوم ہوئیں لیکن ان سب سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا کہ مرزائیوں میں مسلمانوں کے لئے تعصب اور تنفر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

ربوہ میں قیام کے دوران جو دیکھا اور محسوس کیا وہ سب وقت کی دھول اور مصروفیت کی گرد تلے دبتا چلا گیا۔ قلم و کاغذ سے رشتہ ہونے کے باوجود کبھی بھولے سے بھی یہ خیال ذہن میں نہیں آیا کہ کفرستان میں قیام کی روداد پر خامہ فرسائی کی جائے۔

چند برس پہلے ایک روز اپنے ایک جاننے والے کے گھر بیٹھا تھا۔ ان کے ہاں ڈش نصب تھی۔ ٹیلی ویژن آن تھا۔ چینل بدلتے ہوئے اچانک "احمدیہ ٹیلی ویژن نیٹ ورک" آ گیا جس پر مرزا طاہر کا نام نہاد جمعہ کا خطبہ نشر ہو رہا تھا۔ موصوف کا کہنا تھا کہ "پاکستان میں ہم جن قابل تعزیر جرائم کی زد میں آتے ہیں' ان میں ہمارے گھروں سے قرآن کا برآمد ہونا' کسی کو السلام علیکم کہنا یا نماز پڑھنا شامل ہے۔ جبکہ پاکستانی علماء اغواء' بدفعلی' زیادتی اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرائم میں دھرے جاتے ہیں۔ موازنہ کیا جائے

کہ قصور وار اور جرم دار کون ہے؟"۔

مرزا طاہر کی طرف سے جس ڈھٹائی سے خود کو معصوم اور پاکستانی علمائے کرام کو مطعون کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی' اسے سن کر میری سوئی ہوئی یادوں نے انگڑائی لی اور قیام ربوہ کے دوران دیکھے ہوئے مرزائیوں کے کئی "کالے کرتوت" یاد آنے لگے اور بے اختیار چاہا کہ کاش یہ شخص میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا اور اس کی امت کا کچا چٹھا اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا۔ میرے پاس کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ خواہش دل ہی دل میں رہ گئی۔ لیکن قدرت کو شاید میرے جذبے پر کچھ زیادہ ہی پیار آگیا۔ اس لئے اس نے مرزائیوں کو آئینہ دکھانے کے لئے مجھے جلد موقع فراہم کر دیا۔

علامہ انور طاہر صاحب میرے مشفق اور مہربان دوست ہیں۔ ایک شب پریس کلب میں ان کے ہمراہ کھانا کھا رہا تھا کہ انہیں ملنے کے لئے محمد طاہر رزاق صاحب تشریف لائے۔ مرزائیت کے خلاف طاہر صاحب کے جہاد کے تذکرے کے بعد علامہ صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "اعوان صاحب گیارہ برس ربوہ نشین رہے ہیں"۔ طاہر صاحب سے گفتگو شروع ہوئی تو میں نے انہیں قیام ربوہ کے مختلف واقعات سنائے جس پر طاہر صاحب نے مجھے اس بارے میں یادداشتیں تحریر کرنے کے لئے کہا جس سے ربوہ کی عام شخصی زندگی سے پردہ اٹھتا ہو۔

علامہ صاحب کی تحریک اور محمد طاہر رزاق صاحب کی تائید سے میرا قلم متحرک ہوا اور یہ کتاب شروع کر دی گئی۔ کتاب کیا ہے' ربوہ میں قیام کا روزنامچہ ہے جو چھٹی جماعت سے بی۔ اے تک ایک طالب علم کی سال بہ سال کی یادوں اور محسوسات کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں کسی تصنع و بناوٹ کا سہارا لیے بغیر اس زمانے میں آنکھوں نے جو دیکھا اور دماغ نے جو محسوس کیا' وہ لکھ ڈالا۔

کتاب مرزائیت کے خلاف ضرور ہے لیکن اس میں مخالفت برائے مخالفت کا عنصر کہیں بھی نہیں۔ تاہم رسالت اور ختم نبوت کے فلسفے سے محبت کا اثر بہرحال

موجود ہے۔ جو ہر مسلمان کے ایمان کا اقتضا ہے کہ جو شخص بھی ہمارے پیغمبر آخر' پیغمبر اعظم ﷺ کے کاشانہ نبوت میں نقب لگائے وہ مسلمہ کذاب ہو یا قادیان کا مرزا غلام احمد اس سے نفرت اور جنگ ضرور کی جائے گی۔

چنانچہ ربوہ اور اس کے مرزائی مکینوں کے بارے میں میرے ذہن میں جو سچ محفوظ تھا' میں نے جہاد سمجھ کر محض اس وجہ سے لکھ ڈالا کہ "مرزا غلام احمد" کو جہاد سے نفرت تھی۔ میری اس کتاب کو پڑھ کر اگر ایک مرزائی بھی مرزائیت سے متنفر ہو کر تائب ہو جاتا ہے تو یہ میری فلاح کا باعث ہو گا۔

کتاب کی تیاری میں میرے قلم و ذہن کا جتنا دخل ہے' اس سے کہیں زیادہ علامہ صاحب کی رہنمائی اور طاہر رزاق صاحب کے مفید مشورے شامل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب طاہر رزاق صاحب اور علامہ صاحب کی مساعی مشکور کا نتیجہ ہے تو غلط نہیں ہو گا۔

ناقدری الفت ہو گی کہ یہ سطور شفیق مرزا صاحب کے ذکر سے خالی رہیں۔ کہنہ مشق صحافی' دانشور اور صاحب علم مرزا صاحب نے مرزائیت کے رگ و ریشے کی جراحت جس طرح کی ہے اس کی شاہد تو "شہر سدوم" ہے تاہم احمقوں کی جنت' انہوں نے حرف حرف پڑھی اور بہت سے ایسے نکات سے آگاہ کیا جن سے ناآشنائی ' نارسائی اور ناآگاہی کے باعث یہ کتاب ادھوری اور ناوک تنقید کا نشانہ بنتی۔ روداد الفت میں عزیز من اشرف صاحب نے سوانحی خاکہ بیان کرتے ہوئے میری بہت تعریف کی ہے یہ ان کی نوازش ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

کتاب میں مختلف تذکروں کے دوران مرزائی شہریوں' محلوں اور مقامات کے نام مصلحتاً تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

جی آر اعوان

لاہور

ویرانی سی ویرانی

۱۹۶۵ء کے شروع کی بات ہے' ہم ساہیوال ضلع سرگودھا میں رہتے تھے کہ ابا جی کا تبادلہ ربوہ ہو گیا۔ وہ محکمہ زراعت میں ملازمت کرتے تھے۔ ہمارا آبائی شہر بھیرہ ضلع سرگودھا ہے۔ بھیرہ جہاں اولیا خیز سر زمین ہے' وہاں مرزائیوں کا گڑھ بھی ہے۔ مرزا قادیانی کا پہلا خلیفہ حکیم نورالدین بھی بھیرہ کا ہی رہنے والا تھا۔ جس نے "مرزا غلام احمد" کی جھوٹی نبوت کو چار چاند لگائے۔ انہی دنوں ہماری پھوپھی زاد بہن کی شادی تھی' جس میں شرکت کے لئے ہم ساہیوال سے بھیرہ آئے تو وہاں کے مرزائیوں نے ہمارے گھر میلہ لگا دیا۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ہم ربوہ جا رہے ہیں تو ان کی خوشیاں دیدنی تھیں۔ حافظ اشرف' اماں خدیجہ' مبارک بک سیلر' بشارت چکی والا' مبارکہ درزن غرض ہر مرزائی شخص ہمیں ملنے آیا۔ یہ لوگ یوں مل رہے تھے جیسے ہم حج یا عمرہ کرنے دیار حبیب ﷺ جا رہے ہوں۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان مرزائیوں کی اس وارفتگی کی غایت کیا ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان کے پاؤں زمین پر اس لئے نہیں "ٹک" رہے کہ ان کے خیال میں ربوہ جا کر ہم لوگ مرزائی ہو جائیں گے۔

میں نے پانچویں جماعت ساہیوال میں مفتی صاحب کے سکول میں پڑھی تاہم امتحان پیر کرم شاہ صاحب کے محمدیہ غوثیہ پرائمری سکول بھیرہ سے پاس کیا تھا۔ مزید تعلیم کے لئے چھٹی جماعت میں ربوہ جا کر داخلہ لینا تھا۔ جن دنوں کا یہ ذکر ہے' تب مرزائیوں کو کافر تو سمجھا جاتا تھا لیکن ملکی قانون کے اعتبار سے وہ غیر مسلم نہیں تھے۔ انہیں عام طور پر مسلمانوں کے ہی ایک فرقے جیسی حیثیت حاصل تھی۔ لہٰذا مرزائیوں سے میل جول' لین دین اور کھانا پینا اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بھیرہ کے مرزائی نشینوں نے ابا جی کو اپنے ربوہ مکین عزیزوں اور رشتہ داروں کے حوالے اور پتے دیئے'

بلکہ اپنے عزیزوں کو ان لوگوں نے خطوط کے ذریعے ہماری آمد کے بارے میں مطلع بھی کر دیا۔ چنانچہ جب ہم ربوہ آئے تو وہ سب ہمارے منتظر اور چشم براہ تھے۔

ہم لوگ ابھی بھیرہ میں ہی تھے کہ ابا جی چارج سنبھالنے ربوہ چلے گئے۔ وہاں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ مرزائی انتظامیہ' امت اور جھوٹی نبوت کا دعویدار مرزائی خاندان مسلمان سرکاری ملازمین کو صرف اسی صورت میں ربوہ میں ٹکنے دیتا ہے' اگر وہ ان کی بات مانتے رہیں۔ بصورت دیگر ان کا تبادلہ کروا دیا جاتا ہے۔ ابا جی کے پیش رو کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ربوہ میں قیام اور مرزائیوں کو ٹھکانے پر رکھنے کے لئے ٹھوس حکمت عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی سب سے پہلی ملاقات تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل مرزا ناصر احمد سے ہوئی' جو بعد میں مرزائیوں کے تیسرے خلیفہ بنے۔

محکمہ زراعت کا دفتر اور متعلقہ آفیسر کی رہائش گاہ شہر سے دور دریائے چناب کے پاس تھی۔ کیونکہ شہر میں کوئی شخص مرزائی مرکز کی اجازت کے بغیر رہائش نہیں رکھ سکتا تھا۔ ابا جی نے سب سے پہلے دفتر اور رہائش شہر میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ شہر میں رہ کر وہ تمام حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے جو ایک پاکستانی شہری کا حق ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی مقصد تھا کہ مرزائیت کو قریب سے دیکھا جا سکے۔

ابا جی نے مرزا ناصر احمد سے ملاقات کر کے بتایا کہ وہ اپنا دفتر اور رہائش شہر میں رکھیں گے اور سرکاری ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے ان سے مخلصانہ تعاون کرتے رہیں گے۔ لیکن ربوہ میں قیام کے دوران اپنی نجی اور مذہبی زندگی میں کوئی مداخلت برداشت نہیں کریں گے۔ مرزا ناصر احمد نے ابا جی کو بتایا کہ آپ سے پہلے اکثر زراعت آفیسر ہم سے تعاون نہیں کرتے رہے لہٰذا ہمیں اپنے زرعی مسائل اور فصلوں اور باغات کی نگہداشت کے لئے ذاتی زرعی عملہ رکھنا پڑا۔ آپ ہمیں مخلصانہ تعاون فراہم کریں تو ہمارا وعدہ ہے کہ آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے' ربوہ میں کسی مسلمان کے لئے گھر حاصل کرنا جوئے

شیر لانے کے مترادف تھا۔ لہٰذا ہمیں بھی ذاتی طور پر کسی مرزائی سے کرائے کا گھر نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ مرزا ناصر نے ابا جی کو شہر میں رہائش اور دفتر کے لئے ایک کشادہ مکان لے کر دیا۔

اپریل ۱۹۶۵ء کے آخری ایام تھے جب ہم بھیرہ سے عازم ربوہ ہوئے۔ لاہور جاتے ہوئے کئی بار ربوہ کا نام سنا لیکن اس روز ہم اسے دیکھنے اور وہاں رہنے پہلی بار جا رہے تھے۔ مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے ہم نے پہاڑوں کے دامن میں واقع وادی کفرستان میں پہلا قدم رکھا۔ بس ایک ویران سی جگہ پر رکی۔ ہمارا سامان اتارا اور روانہ ہو گئی۔ اس وقت ربوہ کا لاری اڈہ مرزائیوں کے "قصر خلافت اور مسجد مبارک" کے پاس ہوتا تھا۔ اڈے پر ایک چونگی محرر اور ایک قلی نما شخص تھا' جس کا نام غالباً" سیف الرحمٰن تھا۔ باقی ہر طرف "ہو" کا عالم اور کوئی ویرانی سے ویرانی تھی۔

میں' میرے بہن بھائی اور امی جان اڈے پر حیران کھڑے سوچ رہے تھے "یا رب یہ کیسی بستی ہے جہاں بندہ نہ بندے کی ذات" سب ابا جی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں "آپ ہمیں کہاں لے آئے ہیں؟"۔

کافی دیر بعد دور سے ایک تانگہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ جب وہ اڈے پر پہنچا تو ابا جی نے اسے "محلہ دار الرحمت غربی' الفضل والی گلی" چلنے کو کہا۔ کوچوان نے سامان تانگے میں رکھا۔ ہم سوار ہوئے اور تانگہ واپس سرگودھا کی طرف چل پڑا۔ سڑک کے دائیں جانب تو صرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے جبکہ بائیں جانب خار دار درختوں کے پار ایک جیسی کوٹھیوں کی قطاریں تھیں۔ جن میں بیشتر کے در و دیوار سفید اور سبز تھے۔ کوئی ڈیڑھ میل کی مسافت کے بعد تانگہ محلہ دارالصدر کی عقبی سڑک سے شہر میں داخل ہوا۔ اس نیم پختہ سڑک کا نام تو اب میرے ذہن میں نہیں' تاہم سرگودھا کی طرف شہر کی یہ آخری سڑک تھی۔ مکانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو راستے میں کئی مکین بھی نظر آئے۔ عجیب و غریب **شکلوں** والے لوگ تھے۔ یوں لگتا تھا ہم کسی اور ہی ملک میں آ گئے ہیں۔ مختلف گھروں کی دیواروں پر کچھ عبارات تحریر تھیں جن کے نیچے الہام

حضرت مسیح موعود لکھا ہوا تھا۔

ان عبارات میں سے کچھ یوں تھیں :

"مرزا غلام احمد کی جے"

"بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے"

تانگے کا گھوڑا مریل' تانگہ کھٹارا اور کوچوان عجیب یبوست زدہ تھا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک نے تو ہمارے انجر پنجر ہلا کر رکھ دیے اور بالاخر ہم الفضل والی گلی کے اس مکان کے سامنے آ پہنچے جس پر لگی ہوئی سنگ مرمر کی تختی پر "امین منزل" لکھا ہوا تھا۔ یہ گلی ربوہ کے مغربی کنارے کی آخری گلیوں میں سے تھی۔ اس کے بعد صرف ایک گلی تھی' جس کے دوسری طرف کافی دور ایک گاؤں نما آبادی تھی جسے "چمن عباس" کہتے ہیں۔

گھر خاصا کھلا اور بڑا تھا۔ ہمیں گھر چھوڑ کر ابا جی بازار سے کھانا وغیرہ لینے چلے گئے۔ کھانا کھا کر ہم چارپائیوں پر دراز ہو گئے۔ ہم میں سے ہر ایک سوال پر سوال کر رہا تھا کہ "ہم کہاں آ گئے ہیں؟ یہ تو ویران سا شہر ہے۔ ہمارا دل یہاں کیسے لگے گا؟" تھکے ہوئے ابا جی نے یہ کہہ کر ہم سے جان چھڑائی کہ "صبح ہو لینے دو آپ لوگوں کی تمام حیرانیاں اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی"۔ تھکے ہوئے تو خیر ہم تھے' تھوڑی ہی دیر بعد نیند کی وادیوں میں گم ہو گئے۔ اگلے روز اٹھے تو سب سے پہلے میرے کانوں نے جو سنا وہ ایک گونج دار آواز تھی:

"چھولے بڑے پولے"

ابا جی نے مجھ سے کہا "یہ آواز سنی ہے؟" کہا "جی سنی ہے" اس پر انہوں نے بتایا ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک بازار ہے۔ جس کو غلہ منڈی یا رحمت بازار کہا جاتا ہے۔ یہ آواز وہاں سے آئی ہے۔ پھر انہوں نے ہمیں گھر اور اس کے حدود اربعہ کے متعلق بتایا "اس محلے کا نام دار الرحمت غربی اور سڑک نما گلی کا نام الفضل والی گلی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ربوہ سے مرزائیوں کا ایک اخبار بھی شائع ہوتا ہے جس کا

نام ""الفضل" ہے۔ اس کا دفتر اسی گلی میں ہے جب کہ چمن عباس میں زیادہ تر اہل تشیع بستے ہیں۔ تاہم وہاں چنگڑ قوم بھی آباد ہے۔ شہر کے بارے میں انہوں نے مزید بتایا کہ ربوہ میں سب سے بڑا گول بازار ہے جب کہ ایک کچا بازار بھی ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ مجھے بازار لے گئے۔ بازار اور لوگوں کو دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی کہ یہاں بھی کوئی رہتا ہے۔

الفضل والی جس گلی میں ہمارا گھر تھا' اس کے ایک طرف مستری فضل دین سائبیریا والے' دوسری طرف ٹاؤن کمیٹی ربوہ کے سیکرٹری نور احمد عابد' تیسری طرف ابراہیم پہلوان رہتے تھے جبکہ چوتھی جانب سڑک تھی اور اس کے پار کھلا میدان تھا۔ جس کی ایک طرف چاچا محمد حسین اور بابا ہل جل کا گھر تھا۔ جب کہ اس کے ساتھ ہی چودھری سربلند خان کا گھر تھا۔ ہمارے گھر پر نصب ""امین منزل" کی تختی دراصل مالک مکان محمد امین زرگر کے نام سے موسوم تھی جو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور صرف مرزائیوں کے جلسہ سالانہ پر ہی وہ ربوہ آیا کرتے تھے ----- اس گلی میں زیادہ تر متوسط طبقے کے ملازم پیشہ اور محنت مزدوری کرنے والے مرزائی آباد تھے۔ مسلمانوں کا صرف ایک گھر تھا اور وہ ہمارا تھا۔ تاہم گلی میں ایک قابل ذکر شخصیت صوفی بشارت الرحمٰن رہتے تھے جو عربی کے پروفیسر تھے جو بعد ازاں تعلیم الاسلام کالج کے وائس پرنسپل بھی بنے۔ صوفی صاحب کو نہ جانے کیا بیماری تھی کہ وہ اپنے گھر سے نکلتے ہی کھنگھارنا شروع کرتے اور منزل مقصود تک پہنچنے تک یہ عمل جاری رکھتے۔ ان کی یہ عادت ان کے گھر سے باہر نکلنے کا اعلان ہوتی تھی۔

پینے پر کوئی پابندی نہیں

ربوہ میں بس کے ذریعے آئیں تو سڑک کی ایک جانب پہاڑ ہی پہاڑ اور ان کے دامن میں مرزائیوں کا جنت دوزخ ہے۔ جبکہ دوسری جانب دریائے چناب تک شہر آباد ہے۔ تاہم دریا کے قریب سڑک کے دونوں جانب آبادیاں ہیں۔ پرانے اڈے سے شہر کی طرف داخل ہوں تو ایک طرف قصر خلافت اور اس سے ملحقہ "پوش علاقہ" ہے۔ لاری اڈے سے شہر آنے والی یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جس کے ایک حصے پر قصر خلافت جامعہ نصرت کالج و نصرت گرلز ہائی سکول ہے اور دوسری جانب یہی سڑک امور عامہ اور تحریک جدید کے دفاتر کے سامنے سے گزرتی ہوئی گول بازار میں داخل ہو جاتی ہے۔ گول بازار بھی دراصل گول نہیں بلکہ درانتی کی مانند آدھا گول ہے۔ اب تو شہر کی شکل بدل چکی ہے' تاہم ۱۹۶۵ء میں اس کی صورت ایسی ہی تھی' جیسی بتلائی جا رہی ہے۔ دکانوں کا سلسلہ منان ٹیلر کی دکان سے شروع ہو کر زیرہ ہاؤس پر ختم ہوتا تھا۔ زیرہ ہاؤس کے سامنے سے ایک سڑک گزرتی ہے جو ریلوے پھاٹک کو کراس کرتی ہوئی شہر کے دوسرے حصے کی طرف جاتی ہے۔ جس پر فضل عمر ہسپتال' ٹیلی فون ایکسچینج اور تنویر سٹوڈیو وغیرہ آتے ہیں۔ ریلوے لائن شہر کے وسط میں سے گزرتی ہے جس کے ساتھ ساتھ جانے والی ریلوے روڈ دریا کی طرف اور غلہ منڈی اور فیکٹری ایریا کی طرف جاتی ہے۔ دریا کی طرف جانے والی اسی سڑک پر جامعہ احمدیہ' تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج ہیں۔

ربوہ کی تمام گلیاں کشادہ اور سڑک نما ہیں۔ تب گلیاں تو کچی تھیں تاہم ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈے سے شہر کے مختلف حصوں کو جانے والی اور قصر خلافت اور اس سے ملحقہ علاقے کی سڑکیں نیم پختہ تھیں۔ انہیں تارکول ڈال کر پختہ بنانے کی بجائے ان پر موٹی بجری ڈال کر اوپر سرخ کیری بچھا کر پختہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

یہ سڑکیں بھی "مرزا غلام احمد" کی نبوت کی طرح جعلی تھیں جن کی قلعی بارش ہوتے ہی کھل جاتی۔ ان پر پڑی ہوئی "سرخ کیری" لال کیچڑ بن کر لوگوں کے کپڑوں پر نقش و نگار بنا دیا کرتی تھی۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ جعلی خاندان نبوت نے انتہائی متمول و مالدار ہونے کے باوجود سڑکوں کی تعمیر پر توجہ کیوں نہیں دی تھی۔

ربوہ کے تمام داخلی راستوں پر بڑے بڑے سائز کے بورڈ آویزاں تھے جن پر جلی حروف میں "سگریٹ نوشی ممنوع ہے" لکھا ہوا تھا۔ یہاں آنے والے اجنبی ان بورڈوں کو پڑھ کر اکثر سگریٹ پھینک یا جیبوں میں اچھی طرح چھپا دیا کرتے تھے۔ میں نے شہر میں پھرتے ہوئے دیکھا کہ ہر کریانے کی دکان پر نہ صرف سگریٹ فروخت ہوتے بلکہ چلتے پھرتے لوگ سگریٹ پیتے بھی نظر آتے تھے۔ جبکہ پان سگریٹ کے کئی کھوکھے بھی تھے۔ گول بازار میں پان سگریٹ کی سب سے بڑی دکان "فہیم موٹے" کی تھی۔ اس سلسلے میں لوگوں سے پوچھا گیا کہ جب شہر میں سگریٹ نوشی ممنوع ہے تو یہاں سگریٹ کی دکانیں کیوں ہیں۔ بتایا گیا کہ سرعام سگریٹ پینا منع ہے۔ گھروں کے اندر سگریٹ' حقہ اور بیڑی پی جا سکتی ہے۔ بعد میں پتہ چلا یار لوگ پینے والی بہت سی چیزیں چھپ کر پی لیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہوتی تھی۔ جب سرعام سگریٹ پینے والوں کا ذکر کیا گیا تو ایک شرمندہ سے تبسم کے علاوہ کوئی جواب نہ مل سکا۔

ربوہ میں اردو کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی تھے جن کے والد مولوی احمد خان نسیم مرزائی مبلغ تھے جو پاکستان بھر کے دیہات کے دورے کر کے سادہ لوح دیہاتیوں کو گھیر گھار کر مرزائی بناتے تھے۔ ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی "قینچی" کے سگریٹ پیتے تھے۔ ان کے لئے شہر کا ایک مخصوص دکان دار خصوصی طور پر اس برانڈ کے سگریٹ منگوایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر پروازی جامعہ احمدیہ کے کواٹروں میں رہتے تھے۔ ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتے ہوئے جب وہ تعلیم الاسلام کالج پڑھانے جاتے تو کھلے عام سگریٹ پیتے ہوئے جاتے تھے جب کہ ایم ایم احمد کے بھائی ہسٹری کے پروفیسر مرزا مجید عرف میاں موجی تو کار میں آتے جاتے' کلاس پڑھاتے وقت اور سرعام بھی

"پائپ" منہ میں ٹھونسے رکھتے تھے۔ شہر میں سگریٹ نوشی کی جتنی ممانعت تھی' اتنی زیادہ سگریٹ کی فروخت ہوتی تھی۔ مرزائیت کو میرا نارسا ذہن تو پہلے ہی سمجھتا تھا' مگر سگریٹ نوشی کے متعلق ان کی دو رنگی نے "مرزا غلام احمد" کی نبوت کا فلسفہ مزید واضح کر دیا کہ مرزائیت منافقت آگیں اور دو نمبر مذہب ہے۔

ربوہ میں تمام مکانوں کی ترتیب اور نقشے ایک جیسے ہیں۔ یعنی ایک گلی کے مکانوں کا عقبی حصہ دوسری گلی کے مکانوں کے عقبی حصے کے ساتھ ملتا تھا۔ تمام مکانوں کی تعمیر "ایل" کی شکل میں کی ہوئی تھی جب کہ ہر گھر میں ایک درخت بھی لگا ہوتا تھا۔ ان دنوں ربوہ میں ٹیلی فون ایکسچینج لگے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ چنانچہ مرزائی مرکز کے حکم پر اکثر و بیشتر مرزائیوں کے گھروں میں ٹیلی فون تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ہی ربوہ میں سوئی گیس کی تنصیب ہوئی تو مرزائی امت اس وقت سوئی گیس کی سہولت سے مستفید ہوئی جب ملک کے باقی عوام اس سے محروم تھے۔

ربوہ میں ہر چھوٹے بڑے شخص نے ٹوپی پہن رکھی ہوتی تھی جسے دیکھ کر بہت حیرت ہوتی تھی۔ ٹوپیوں کی اقسام مختلف تھیں۔ تاہم ہر سر رام پوری' جناح اور لیاقت کیپ سے ڈھکا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ ننگے سر پھرنا "مرزا غلام احمد" کے حکم کے منافی ہے۔ چنانچہ تمام مرزائی امت ہر وقت ٹوپی پہنے رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ربوہ کے ہر شہری نے عجیب و غریب ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ عام طور پر ڈاڑھی سے انسان کا چہرہ نورانی ہو جاتا ہے لیکن مرزائی لوگوں کی صرف ٹھوڑی پر لٹکی ہوئی ڈاڑھی نے تو ان کے حلیے ہی بگاڑ کر رکھ دیئے تھے۔ ہر شخص انتہائی مکروہ صورت لگتا۔ پتہ چلانے پر بتایا گیا کہ یہ فرنچ کٹ ڈاڑھی ہے جو مرزائی امت اپنے لئے مسنون سمجھتی ہے۔

"رحمت بازار غلہ منڈی" میں لاہور ہاؤس' شاہد کلاتھ ہاؤس' بھٹی چیپ سٹور' سلیم ورائٹی ہاؤس' نعیم پیپسی ہاؤس اور دارالخیر جنرل سٹور بہت مشہور دکانیں تھیں۔ دکاندار تو سارے ہی مرزائی اور اپنے "نبی" کی طرح بڑے طرار تھے لیکن شاہد کلاتھ ہاؤس اور دارالخیر جنرل سٹور والے سب پر بازی لے گئے تھے۔ یہ دونوں ہاتھوں سے

لوٹتے بھی تھے اور ان کی دکانوں میں حوروں کی بھیڑ بھی لگی رہتی تھی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ دارالخیر جنرل سٹور کے مالک امین کی بیوی معمولی شکل و صورت کی خاتون تھی۔ اس کے ایک دوست نے اس کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو امین نے بے نیازی سے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شہر کی ہر ماہ جبین تو میری جیب اور دکان پر ہوتی ہے۔ گول بازار میں بھی بہت سی دکانیں تھیں لیکن مون لائٹ جنرل سٹور ' بیت اللباس اور احمدیہ ماڈرن سٹور قابل ذکر ہیں۔ مون لائٹ جنرل سٹور کے مالک کو "پیر جی" کہتے تھے۔ یہ شخص نہایت اچھا آدمی تھا۔ شنید ہے کہ وہ اندر خانے مسلمان ہو گیا تھا تاہم بعد میں ربوہ کے قریب ہی ایک حادثے میں انتقال کر گیا تھا۔ لیکن احمدیہ ماڈرن سٹور جو ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور تھا' اس کا مالک تو اول درجے کا بے ایمان تھا۔ مرزائی امت اس دکان کو احمدیہ مادر ـــــ سٹور کہا کرتی تھی۔

ربوہ میں آمد کے ایک دو روز بعد میں نے اباجی کے ہمراہ مختلف دکانوں سے شاپنگ کی۔ کتابیں اور یونیفارم خریدا۔ ربوہ کے بازاروں میں نور کاجل اور "الیس اللہ" کی انگوٹھیوں کے بہت سے اشتہاری بورڈ لگے ہوئے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ انگوٹھیاں تو "مرزا غلام احمد" کے الہام پر مبنی ہیں جب کہ کاجل خلیفہ اول نورالدین کے کیمیائی نسخوں میں سے تھا۔ "الیس اللہ" کی انگوٹھیاں مرزائی امت خیر و برکت کے طور پر پہنتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ٹوپی' فرنچ کٹ ڈاڑھی کے بعد مرزائیوں کا ٹریڈ مارک یہ انگوٹھیاں تھیں۔

ہماری گلی کی آخری نکڑ پر الفضل اخبار کا دفتر تھا۔ یہ روز نامہ کم اور مرزائی نامہ زیادہ تھا۔ جس کی پیشانی کے ساتھ مرزائی خلیفہ کی صحت کی تازہ ترین تفصیلات کے ساتھ روزانہ اس کی درازی عمر کی دعا کے لئے امت سے درخواست کی جاتی تھی۔ اخبار کے ایڈیٹر کا نام روشن دین تنویر تھا۔ اس نام پر ہم لوگ ہنسا کرتے تھے کہ موصوف روشن بھی ہیں اور تنویر بھی۔ اخبارات کے دفاتر کا خاصا ہے کہ اس کے اندر گہما گہمی ہوتی ہے۔ نیوز روم میں سب ایڈیٹر اور رپورٹنگ روم میں رپورٹر ہوتے ہیں

لیکن اس دفتر میں روشن دین تنویر' ایک آدھ کاتب اور دو ایک دیگر افراد کے علاوہ ویرانی ہی ویرانی تھی۔ مذکورہ لوگوں کے چہرے بھی نہایت سوگوار اور آدم بیزار سے لگتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں زبردستی کسی جرم کی سزا دے کر یہاں بٹھا دیا گیا ہو۔

الفضل کو اگر تبلیغی سرکلر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ضیا الاسلام پریس سے جاری ہونے والے اس اخبار میں مرزا قادیانی کے پرانے خطبے اور "نور کاجل اور ہاضموں" کے اشتہاروں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی خریداری تمام مرزائی امت کا فرض لازم تھی۔ اخبار کے دفتر کے باہر اگر جہازی سائز کا بورڈ آویزاں نہ ہوتا تو اس کے اخبار کے دفتر ہونے کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اخبار میں مرزائی قارئین کو بتانے کے لئے بیرون ملک مرزائی مبلغین کی سرگرمیاں تحریر کی جاتیں کہ "انہوں نے فلاں فلاں ملک میں کتنے لوگوں کو داخل کفر کر لیا ہے" اس طرز عمل سے مرزائیوں کو یہ بتانا بھی مقصود ہوتا تھا کہ مرزائی مذہب دنیا میں زیادہ سے زیادہ فروغ پا رہا ہے۔ اندرون و بیرون ملک مرزائی امت پر اخبار کی خریداری اس لئے بھی لازم تھی کہ اس سے اخبار کی آمدن میں اضافہ ہو سکے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نام نہاد اخبار کے درپردہ مرزائیوں کا کوئی خفیہ مشن بھی تھا کیونکہ مرزائیوں کی یاوہ گوئی پر مبنی مذہبی کتب اسی پریس پر اخبار کی آڑ میں چھپا کرتی تھیں۔ اخبار کا پریس بھی کسی نامعلوم جگہ پر نصب کیا گیا تھا۔

جونک نہیں لگتی پتھروں کو

ربوہ آتے ہی بھیرہ کے مختلف ربوہ نشینوں نے ہماری دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بھیرہ کے جن لوگوں نے ہمیں ربوہ میں مقیم اپنے رشتہ داروں کے حوالے اور پتے دیئے تھے' انہوں نے بھرپور انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز ایک دعوت ہونے لگی۔ جن خاندانوں نے ہمیں بھرپور پروٹوکول دیا' ان میں میاں عطاالرحمٰن فیملی قابل ذکر ہے۔ بھیرہ نژاد یہ خاندان "خاندان طبیعات" کہلاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گھر کے فرد اول میاں عطاالرحمٰن ربوہ کے ڈگری کالج میں فزکس کے پروفیسر تھے اور ایم۔ ایس سی طبیعات کی کلاسیں لیتے تھے۔ جب کہ ان کے بیٹے لطف الرحمٰن' لطف المنان' حبیب الرحمٰن اور شفیق الرحمٰن سب کے سب فزکس میں ماسٹر ڈگری یافتہ تھے۔ لطف الرحمٰن تو ہمارے سکول میں سائنس ٹیچر بھی رہے تھے۔ بعد ازاں وہ بیرون ملک چلے گئے جبکہ لطف المنان تعلیم السلام کالج ربوہ میں فزکس پڑھاتے تھے۔ میاں عطاء الرحمٰن کی تین بیٹیاں امتہ الطیف' امتہ الرفیق اور امتہ السمیع تھیں۔ اول الذکر دونوں نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھاتی تھیں جبکہ امتہ السمیع میری کلاس فیلو تھی۔

اس خاندان کی ہمارے ساتھ وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نہ صرف ہماری دعوت کی بلکہ مجھے اور میری ایف۔ اے کی طالبہ بہن کو پڑھانے کی پیشکش بھی کر دی۔ ہمیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ چنانچہ میری بہن میاں عطاء الرحمٰن کی بڑی بیٹی امتہ الطیف اور میں امتہ الرفیق کے پاس پڑھنے لگا۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر روز شام وہ پڑھنے کے دوران ہمیں ٹھنڈا دودھ بھی پلاتے اور جس روز ہم پڑھنے نہ جاتے' ان کے گھر سے فوراً" کوئی نہ کوئی ہمارے نہ آنے کی وجہ پوچھنے ہمارے گھر آ جاتا۔ یہ سلسلہ چھ سات مہینے چلتا رہا۔ اس دوران امتہ الطیف میری بہن کو کپڑے بھی

سی کر دیا کرتی تھیں۔ ان لوگوں کی طرف سے براہ راست تو ہمیں مرزائیت قبول کرنے کی کبھی کوئی پیشکش نہیں ہوئی۔ تاہم میاں عطاء الرحمٰن کی اہلیہ فضل الٰہی بیگم ہم دونوں بہن بھائیوں کو یہ ضرور بتاتی رہتی تھیں کہ میں جب گھر کا کام کرتی ہوں تو ساتھ ساتھ "در ثمین" کے اشعار پڑھتی رہتی ہوں۔ جب ہم پوچھتے کہ "در ثمین" کیا چیز ہے تو کہتی "یہ ہمارے مرزا غلام احمد کا کلام ہے" پھر وہ اپنے مذہب اور حضرت صاحب کی تعریفیں کرنے لگتی۔ جبکہ اس کی بیٹیاں امتہ الطیف اور امتہ الرفیق اسے ٹوکتے ہوئے کہتیں "امی جان! چھوڑیں یہ قصے ' بچوں کو پڑھنے دیں"۔ امتہ السمیع میرے ساتھ ہر روز ایک بات کرتی "تم نے حضرت مسیح موعود دیکھے ہیں" میں جواب دیتا "نہیں" پھر وہ کہتی "اچھا میں تمہیں دکھاؤں گی"۔ بات آئی گئی ہو جاتی۔ ایک روز اس نے پھر کہا تو میں نے جواب دیا "تم روز کہتی ہو' کسی روز دکھا ہی دو"۔

میرا جواب سن کر وہ بہت خوش ہوئی اور کمرے سے ایک تصویر اٹھا لائی میں نے تصویر دیکھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے "مرزا غلام احمد" کی شکل دیکھی تھی۔ مجھے اس کی شکل اس قدر بری لگی کہ میں کوشش کے باوجود اپنے تاثرات کو زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔ اور برملا کہہ ڈالا "یہ نبی ہے' نبی اس قدر مکروہ صورت نہیں ہو سکتے"۔ میرے جواب پر امتہ السمیع کے چہرے کا رنگ ہی اتر گیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ان لوگوں کی چاہت ماند پڑنے لگی۔ ہم معمول کے مطابق پڑھنے جاتے تو وہ لوگ ایک تو تدریس میں عدم دلچسپی سے کام لیتے دوسرے کبھی طبیعت کی خرابی کا عذر تراش کر پڑھانے سے اجتناب کرتے۔ کبھی مہمانوں کا بہانہ کر کے ہمیں ٹال دیا جاتا۔

مرزا غلام احمد کی تصویر دیکھنے والا واقعہ سننے کے فوراً بعد میرے ابا جی نے ہمیں آگاہ کر دیا تھا کہ یہ لوگ اب تمہیں زیادہ دیر نہیں پڑھائیں گے۔ بہرحال ہم نے ایک آدھ دن یہ روش دیکھی تو پھر ان کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا۔ ان لوگوں نے بعد میں تعلق کو اس قدر موقوف کر دیا کہ آتے جاتے کہیں ملتے تو سلام دعا سے بھی گریز کرتے۔ بعد ازاں بھیرہ سے معلوم ہوا کہ میاں عطاء الرحمن فیملی ہمارے بارے میں

نہایت پر امید تھی کہ ہم بہت جلد مرزائیت اختیار کر لیں گے لیکن ان کے انتہائی حسن سلوک کے باوجود ہم بہت ڈھیٹ نکلے۔ چنانچہ انہیں خود ہی کنارہ کشی کرنا پڑی۔ ہمیں سن کر حیرت کی بجائے مسرت ہوئی۔ ابا جی نے کہا وہ حسن سلوک کے ہزاروں پاپڑ بھی بیل لیتے، تو بھی بھلا پتھر کو کبھی "جونک" لگ سکتی ہے۔

ہم لوگ مرزائیوں سے بحث مباحثے یا مذاکرے کے لئے بہت زیادہ علمیت تو نہیں رکھتے تھے لیکن ایک دین دار گھرانے کے افراد ہونے کے باعث اللہ کے فضل وکرم سے جب بھی کسی مرزائی کے ساتھ "بحث کا میچ" پڑا انہیں ٹھیک ٹھیک جواب دے کر ہمیشہ پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور تو اور میری امی جان جو پڑھی لکھی خاتون نہیں لیکن "گڑھی" ضرور ہیں، وہ بھی مرزائیوں کو "وارے" میں نہیں آنے دیتیں تھیں۔ بھیرہ کے ساتھ ایک قصبہ "نمک میانی" ہے۔ یہ ہمارا ننھیالی قصبہ ہے۔ یہاں کا ایک مرزائی "جلپانہ" خاندان بھی ربوہ میں آباد تھا۔ اس خاندان کی ایک خاتون صالح بیگم محلہ دارالرحمت کی خواتین کی صدر محلہ اور ہماری گلی کی نکڑ پر رہتی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ بھیرہ میانی کی ایک فیملی جو مرزائی نہیں ہے، ربوہ آ چکی ہے۔ چنانچہ وہ ہمارے خاندان پر طبع آزمائی کرنے ایک روز ہمارے گھر آئی۔ تعارف اور حسب توفیق خاطر مدارات کے بعد موصوفہ اصل مقصد پر آنے کے لئے پر تولنے لگیں۔ یہ بات ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ ہم نے زندگی کے کسی موڑ اور مقام پر اپنی بولی نہیں بدلی۔ الحمد للہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ نہایت روانی سے بولتے ہیں لیکن بھیرہ کی بولی سے پیار کا یہ عالم ہے کہیں راستے یا سفر میں کوئی شخص بھیرہ کی بولی بولتا ہوا ملے تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ ہماری امی جان کو بھیرہ کی ٹھیٹ پنجابی بولتے ہوئے صالحہ بیگم نے بات کا آغاز کیا اور کہا "بہن جی! تسی اپنی بولی نئیں بدلی" امی جان نے جواب دیا "ہم لوگ بولی بدلتے ہیں نہ مذہب" امی جان کو "مذہب" کی جگہ دراصل "ذات" کہنا چاہئے تھا مگر انہوں نے دانستہ "مذہب" کا لفظ استعمال کیا۔ درحقیقت وہ اپنی زیرکی کی بنا پر بھانپ چکی تھیں کہ موصوفہ تبلیغ کرنے آئی ہے۔

صالح بیگم نے امی جان کی بات سنی تو اسے اپنا مقصد پورا ہوتا مشکل نظر آیا۔ چنانچہ اس نے کچھ دیر کے لئے موضوع چھیڑنے سے گریز کیا مگر پھر جب اس سے نہ رہا گیا تو کہنے لگی "بہن جی! ہمارے محلے میں جمعرات کو خواتین کا ایک اجلاس ہوتا ہے آپ وہاں آیا کریں۔ اس سے ایک تو واقفیت بڑھتی ہے ' دوسرے وہاں اچھی اچھی دین کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ ضرور آیا کریں"۔ امی جان نے کہا "دیکھیں بہن! جہاں تک واقفیت بڑھانے کا تعلق ہے ' اس کا اول تو مجھے شوق ہی نہیں۔ دوسرے میں مصروف خاتون خانہ ہوں۔ گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ کہیں جایا جائے۔ رہ گئی بات دین کی باتوں کی تو آپ کے اور ہمارے دین میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہم اپنے دین کے بارے میں الحمد للہ بہت کچھ جانتے ہیں"۔ صالح بیگم لاجواب تو ہو چکی تھی' لیکن مرزائیوں کی روایتی خوبی کے پیش نظر ڈٹی رہی۔ مرزائیوں کا خاصا ہے کہ وہ بحث اور تبلیغ کرتے وقت گالیاں اور جوتیاں بھی کھاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح تبلیغ جاری رکھتے ہیں۔ یہ شاید انہیں اپنے "نبی" کی طرف سے ہدایت ہے۔ صالح بیگم نے بھی ہمت نہ ہاری اور پھر کہنے لگی "آپ ایک مرتبہ ہمارے اجلاس میں آئیں تو سہی"۔ امی جان نے بھی حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا "نی بھینا! جس گراں نئیں جانا' اس دا ناں پچھ کے' کے لینا" یہ شافی جواب سن کر صالح بیگم کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اور وہ بے نیل و مرام واپس چلی گئی۔ اسی شام صالح بیگم کا دیور چودھری نذیر جسے لوگ چودھری "ٹیڈی صاحب" کہا کرتے تھے' ہمارے ہاں آیا اور ابا جی سے کہنے لگا "میری بھابھی آپ کے ہاں تبلیغ کرنے آئی تھی مگر آپ کی بیوی کے منہ توڑ جواب نے اس کا خوب مان توڑا۔ وہ تو گھر سے بڑے دعوے کر کے چلی تھی۔ چودھری نذیر نے ابا جی کو بتایا کہ میں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گھر پر فارغ پڑا ہوں۔ ان کو میری بھلائی اور نوکری کا کبھی کچھ خیال نہیں آتا اور دوسروں کو مرزائی بنانے چل پڑتے ہیں۔ اس شخص نے اپنے "نبی" اور اس کی امت کو خوب گالیاں دیں اور کہنے لگا کہ میں تو مجبور ہوں۔ کوئی حیلہ وسیلہ نہیں ورنہ اس جھوٹے مذہب پر لعنت بھیج کر اسے کب کا چھوڑ

چکا ہوتا۔

ہمارے پڑوس میں سیکرٹری ٹاؤن کمیٹی نور احمد عابد رہا کرتے تھے۔ ان کی اہلیہ رشیدہ بیگم نہایت متعصب خاتون تھیں۔ وہ مرزائیت کی آفاقی حیثیت اور جھوٹے خاندان نبوت کی حیثیت اجاگر کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا کرتی تھیں۔ مرزا ناصر کی ہمارے گھر آمد کے بعد وہ ہماری امی جان سے کہنے لگی "آپا جی! اب تو آپ لوگوں کو ضرور کچھ سوچنا چاہئے جس طرح ہمارے حضرت صاحب نے آپ کے گھر آکر کرم فرمایا ہے' اس کا تقاضا ہے کہ آپ لوگ اب احمدی ہو جائیں۔ میری مانیں اور آج ہی بسم اللہ کریں۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے"۔ امی جان ہنڈیا پکا رہی تھیں۔ اس کی بات بھی سن رہی تھیں۔ ہنڈیا میں اطمینان سے چمچہ ہلاتے ہوئے امی جان نے نہایت نرمی سے کہا "آپا جی اللہ کے فضل سے ہم پہلے ہی احمدی ہیں اور اپنے نبی احمد ﷺ کی امت ہیں۔ تاہم مرزائی نہیں ہیں اور اللہ ہمیں معاف کرے اور مرزائیت سے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ رہی بات مرزا ناصر کی آمد کی تو وہ صوفی صاحب اور ان کی دوستی کا معاملہ ہے۔ ہم نے انہیں بلایا نہیں تھا۔ اسی طرح کے ہمارے دوستانہ تعلق تو قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھی رہے ہیں۔ کئی بڑے بوڑھے ہندو سکھ ہم جیسے مسلمانوں کے ہاں آتے جاتے تھے۔ تو کیا ہم ان کی آمد پر ہندو سکھ ہو جاتے۔ یہ بات سن کر موصوفہ کچھ بولے بغیر چلی گئی۔

مرزائیوں کے پاس مسلمانوں کو مرزائی بنانے کا سب سے نادر کلیہ زن' زر اور زمین ہے۔ وہ مجبور لوگوں پر عنایات کی بارش کر کے انہیں دام میں پھنسا لیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ وہ تو حضرت محمد ﷺ کے ہی ماننے والے ہیں اور آپ ﷺ پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے لئے ربوہ شہر کے اکثر در و دیوار پر ایسے شعر رقم کیے گئے تھے جنہیں پڑھ کر باہر سے آنے والے مسلمان ایک بار یقین کر لیتے کہ مرزائیوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی کئی بڑے بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر حسب ذیل

عبارات و اشعار تحریر تھے۔

"اللہ تعالیٰ کہنے میں بڑی برکات ہیں"

"پاک محمد مصطفیٰ سب نبیوں کا سردار"

وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نور سارا
نام اس کا ہے محمد دلبر میرا یہی ہے

جمال و حسن قرآن نور جان ہر مسلمان ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآن ہے

ہو فضل یا رب تیرا یا کوئی ابتلا ہو
راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تیری رضا ہو

ایسی عبارات اور اشعار پڑھ کر اچھا بھلا مسلمان جھانسے میں آ جاتا ہے۔ ربوہ کے علاوہ قادیان میں بھی ایسے کلمات دیواروں اور بورڈز پر تحریر تھے۔ چارسدہ کا ایک پٹھان ہدایت اللہ خان ہمارے ابا جی کا دوست بن گیا۔ اس کو احمدیوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتا اور ابا جی سے کہتا "صوفی صاحب! مہربانی کر کے ہمارے لئے دعا کرو تاکہ ہم اس جہنم سے کسی طرح نکل جائیں"۔ ابا جی نے اس سے پوچھا "خان صاحب! آپ مرزائی ہوئے کیسے؟" کہنے لگا "بھائی کیا بتاؤں میری قسمت خراب تھی۔ ایک بار اپنے ایک دوست سے ملنے گورداس پور گیا۔ وہاں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو احمدی تھا۔ اس نے مجھے نہ جانے کیسے شیشے میں اتارا کہ میں قادیان چلا گیا۔ شہر میں ہر جگہ ہمارے کالی کملی والے نبی ﷺ کی شان میں اشعار پڑھنے کو ملے۔ میں نے سوچا کہ یہ مرزائی تو اپنے جیسے مسلمان ہیں۔ لہٰذا ان کا دین قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ان دنوں بھرپور اور خوبصورت نوجوان تھا۔ مذکورہ شخص مجھے اپنے ایک عزیز کے گھر لے گیا جس کی بیٹی بہت خوبصورت تھی۔ اسے میں نے دیکھا تو پھر کوئی ہوش ہی نہ رہا۔ اس سے شادی کے لئے میں نے بغیر کسی حیل و حجت کے احمدیت قبول کر

لی۔ ان لوگوں نے وہیں میری شادی کر دی۔ میرے والدین مرزائیت کے سخت خلاف تھے لہٰذا میں واپس گھر نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ قادیان کا ہی ہو کر رہ گیا۔ بعد ازاں تقسیم کے بعد ربوہ آ گیا۔ ان میں رہ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مذہب نہ صرف جھوٹا ہے بلکہ اس کے بانیوں اور ماننے والوں میں مکاری اور چالبازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اب تو میری بیوی بھی میری ہم خیال ہو چکی ہے۔ اور ہم دونوں احمدیت سے تائب ہونا چاہتے ہیں۔

ابا جی' خان صاحب کو سلار والا کے صوفی برکت صاحب کے پاس لے گئے جہاں خان صاحب نے اسلام قبول کیا اور کچھ عرصہ بعد ربوہ کو چھوڑ کر چار سدہ واپس چلے گئے۔

ابا جی کو محکمہ کی طرف سے دو "بیلدار" ملے ہوئے تھے۔ ان کی رہائش گاہ بھی ہمارے گھر کے قریب تھی۔ ان میں سے ایک کا نام طالب حسین تھا جبکہ دوسرا متھیلا تھا۔ طالب حسین اچھی شکل و صورت کا چالاک آدمی تھا۔ ان لوگوں کے پڑوس میں ایک شخص ظفر رہتا تھا۔ جس کی بیوی کا نام زبیدہ تھا۔ دونوں میاں بیوی نے طالب حسین کو مرزائیت میں داخل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ زبیدہ تو طالب حسین پر باقاعدہ "لٹو" بھی ہو گئی۔ ابا جی کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے طالب حسین کو بلا کر سمجھایا۔ پہلے تو اس نے ٹالا "ایسی کوئی بات ہی نہیں" مگر جب ابا جی کی طرف سے سرزنش ہونے کے ساتھ یہ دھمکی بھی ملی کہ اس کا تبادلہ کرا دیا جائے گا تو کہنے لگا "یہ بات درست ہے کہ مذکورہ شخص ظفر اور اس کی بیوی نے اسے مرزائیت کے بہت قریب کر دیا ہے"۔ ابا جی طالب حسین کو لے کر فوراً دریائے چناب پر واقع وادی عزیز کے سجادہ نشین صوفی محمد علی صاحبؒ کے پاس لے گئے اور ان سے بیعت کرا دیا۔ جب ظفر اور اس کی بیوی زبیدہ کو یہ خبر ہوئی کہ طالب حسین مرزا ناصر احمد کی بیعت کرنے کی بجائے کسی مسلمان پیر کا مرید بن گیا ہے تو انہوں نے طالب پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے۔

ربوہ کی نواحی بستی چمن عباس میں ایک نذیر چنگڑ کی کریانے کی دکان تھی۔ ربوہ کے مرزائی دکان دار ہر چیز مہنگی بیچا کرتے تھے۔ چنانچہ ربوہ والوں کی اکثریت نذیر چنگڑ کی دکان سے سودا سلف خریدا کرتی تھی۔ ان لوگوں نے سستا سودا خریدنے کا اجر نذیر چنگڑ کو یہ دیا کہ اسے مرزائی کرنے کا منصوبہ شروع کر دیا۔ ہم لوگ بھی اس کی دکان سے ہی سودا سلف خریدا کرتے تھے۔ نذیر نے ابا جی کو بتایا کہ ربوہ والے اسے مرزائیت کی دعوت دے رہے ہیں۔ ابا جی نے اسے فوراً روکا اور کہا "خبردار کافر ہو جاؤ گے۔ مرزا قادیانی تو مرتد اور دجال ہے۔ ان کافروں کے جال سے بچنا"۔ اس پر نذیر نے کہا "صوفی صاحب! آپ مجھے کوئی راہ دکھائیں ورنہ یہ لوگ جس طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، مجھے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ ابا جی کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اسے بھی وادی عزیز لے گئے اور صوفی محمد علی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرا دیا۔ بعد میں مرزائیوں نے حسب معمول نذیر کو جب دعوت تبلیغ دی تو اس نے کہا "تم مجھے روز تبلیغ کرتے ہو آج میری بات بھی سنو"۔ مرزائی سمجھے شاید پنچھی وام میں آنے والا ہے۔ لہٰذا انہوں نے کہا "کہو کیا کہتے ہو؟" اس پر نذیر نے انہیں کہا "مجھے مرزائی بنانے کے بجائے میری مانو اور مرزا غلام احمد کے جھوٹے مذہب سے تائب ہو جاؤ۔ چلو میں تمہیں اپنے پیر کے پاس وادی عزیز شریف لے چلوں"۔ یہ سننا تھا کہ مرزائیوں کے رنگ فق ہو گئے اور پھر انہوں نے نذیر کو مرزائیت کی دعوت دینے کی کوشش نہیں کی۔

محکمہ ٹیلی فون کا ایک ملازم فضل احمد ربوہ میں رہتا تھا۔ راولپنڈی کے اس شخص کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ اس کے بیٹے منور کو مرزائیت سے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ وہ باپ سے ناراض ہو کر اپنی مسلمان پھوپھی کے ہاں پنڈی میں مقیم ہو گیا۔ فضل احمد نے بیٹے کو گھر واپس لانے اور مرزائیت میں داخل کرنے کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں مگر ناکام رہا۔ فضل احمد نے اس سلسلے مین ایک مرزائی مبلغ جمیل الرحمٰن رفیق سے مدد طلب کی۔ موصوف فضل احمد کے گھر آیا اور یقین دہانی کرائی کہ وہ اس

کے بیٹے کو دوبارہ مرزائی کر لے گا۔ لیکن بجائے اس کے کہ جمیل الرحمٰن رفیق منور کو مرزائی کرتا' وہ خود فضل احمد کی بیٹی ناصرہ پر لٹو ہو گیا۔ خوبصورت ناصرہ جمیل الرحمٰن رفیق کو اپنا انکل سمجھ کر اس کی خوب خاطر مدارات کرتی رہی مگر انکل کچھ اور ہی نکلا اور چند روز بعد ہی اس نے فضل کو شادی کے لئے پیغام بھجوا دیا۔ مرزائی مرکز کی طرف سے بھی جمیل الرحمٰن رفیق کی سفارش ہوئی لہٰذا بیچارہ فضل احمد انکار نہ کر سکا۔ چنانچہ اسے اپنی لڑکی کی شادی دگنی عمر کے شخص سے کرنی پڑ گئی۔ جمیل الرحمٰن رفیق ناصرہ کو لے کر چلتا بنا جو اب اس کی کئی بیٹیوں کی ماں ہے۔ یوں فضل احمد بیٹے کو مرزائی بنانے کے چکر میں بیٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

مرزائیوں نے ارتداد کے عجیب و غریب طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ یہ لوگ دیہات کے غریب لڑکوں کو تعلیم دلوانے کا جھانسہ دے کر شیشے میں اتار لیتے تھے اور بعد میں بار احسان تلے دبے ہوئے یہ لڑکے مرزائی ہو جاتے۔ ان مرزائی لڑکوں کو مسلمان خاندانوں کے سامنے غیر مرزائی ظاہر کر کے ان کی شادی مسلمان لڑکیوں سے کر دی جاتی تھی۔ ایک مولوی کا تو یہ باقاعدہ کاروبار تھا۔ وہ جماعت سے فنڈز لیتا۔ دیہاتی غرباء لڑکوں کو تعلیم و ملازمت دلواتا پھر ان کے رشتے مسلمان گھرانوں میں کر دیتا۔ اس شخص نے ایک نہایت شریف اور خدا رسیدہ شخص کے ساتھ ایسا ہی دھوکہ کیا اور اپنے ایک پروردہ "جنگلی" لڑکے کو ایک مسلمان کی تعلیم یافتہ بیٹی کے ساتھ بیاہ دیا۔ دو بچوں کے بعد مذکورہ مسلمان خاندان پر حقیقت کھلی تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے مگر اب تو چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔

اسی طرح مرزائی لڑکوں کی ڈیوٹی تھی کہ وہ مسلمانوں کی لڑکیوں کو شیشے میں اتاریں اور پھر انہیں اپنی زوجیت میں لائیں۔ یہاں ایک واقعہ جو لطیفہ بن گیا' قابل ذکر ہے۔ ایک مرزائی عبدالواسع نے "مری" میں سیر کے دوران ایک لڑکی کے ساتھ مراسم استوار کر لئے۔ وہ بہت خوش تھا کہ ایک مسلمان لڑکی پھنس گئی۔ جس کے عوض اسے مرکز سے بھاری معاوضہ ملے گا۔ مگر بعد میں اس پر انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی چنیوٹ کے

سردار عبدالقادر قادیانی کی بیٹی نجمی ہے جو مسلمان نہیں مرزائی ہے بلکہ وہ بھی جماعت کی طرف سے مسلمان مرد مرزائی بنانے پر مامور ہے۔ اور اس نے مذکورہ شخص کو مسلمان لڑکا سمجھ کر لفٹ کرائی تھی۔ مرزائیوں کے مسلمان عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا گھناؤنا منصوبہ اس قدر عام رہا ہے کہ ایک مرزائی اسلم چودھری نے ایک مسلمان عورت زرینہ عرف بلو سے دوستی کر لی جس کا خاوند تلاش معاش کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ بعد ازاں اس عورت سے مرزائی امت کے اس سپوت نے جس کو خدا کے ساتھ ہم کلام ہونے کا دعویٰ ہے' ایک ناجائز بیٹا پیدا کیا جو اب جوان ہو چکا ہے۔ اس کا نام ارسلان ہے۔

احمدی تو ہم ہیں

ربوہ آئے ہوئے ہمیں کچھ روز گزرے تھے کہ مجھے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں چھٹی جماعت کے سیکشن "سی" میں داخل کرا دیا گیا۔ سکول بہت بڑا تھا اس کے باوجود طلبہ کی زیادہ تعداد کے باعث ہماری کلاسیں بورڈنگ ہاؤس میں لگا کرتی تھیں۔ ہمارے کلاس انچارج ماسٹر بشارت احمد تھے۔ وہ اگرچہ مرزائی تھے تاہم نہایت خلیق انسان تھے۔ انہیں دیکھ کر میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ کاش یہ شخص مرزائی نہ ہوتا۔ کئی بار میرا دل چاہتا کہ ماسٹر بشارت مرزائیت سے تائب ہو جائیں۔ ہمارے پیریڈ نو ہوتے جو مختلف استاد پڑھایا کرتے تھے۔ اساتذہ کی اکثریت مرزائی تھی جن میں تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

کلاس میں جاتے ہی سب سے پہلے مجھے جس چیز کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ ہر لڑکا مجھ سے ایک ہی سوال کرتا "آپ غیر احمدی ہیں" مجھے یہ بات تو بخوبی معلوم تھی کہ غیر احمدی کا مطلب یہی ہے کہ میں مرزائی نہیں ہوں لیکن حیرت یہ تھی کہ ہر شخص آخر مجھ سے ہی کیوں یہ سوال کیوں کر رہا ہے۔ آخر کلاس میں اور بھی تو مسلمان لڑکے ہوں گے۔ میرے ماتھے پر تو یہ نہیں لکھا ہوا کہ میں مرزائی نہیں ہوں۔ گھر آ کر میں نے یہ بات ابا جی کو بتائی تو انہوں نے کہا "تمہارے گلے میں پڑا ہوا تعویذ اس بات کا ٹائٹل ہے کہ تم مرزائی نہیں ہو"۔ ان کی بات واقعی درست نکلی۔ چند روز بعد جب لڑکے مجھ سے بے تکلف ہوئے تو انہوں نے تعویذ کے بارے میں مجھ سے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ میں نے انہیں کئی شافی جواب دیئے لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ جو چیز نہایت دلچسپی کی حامل تھی' جس سے میں آج بھی لطف اندوز ہوتا ہوں' وہ ہے ہماری بھیرہ کی سرائیکی طرز کی بولی' جس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ خاص طور پر میرا "پھر کیا ہوا" کو "وت کے ہویا" کہنا لڑکوں کو عجیب اور نہایت بھلا معلوم ہوا۔

میرا یہ "تکیہ کلام" اس قدر مشہور ہوا کہ اساتذہ اور ساتھی طلبہ جب بھی مجھے ملتے کوئی اور بات کئے بغیر بے ساختہ کہتے "وت کے ہویا" حالانکہ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کے بارے میں مزید کچھ دریافت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلے پہلے مجھے اس طرز عمل سے خفت سی ہوتی لیکن بعد میں' میں نے بھی انجوائے کرنا شروع کر دیا۔

میں نے ربوہ میں لوگوں کو ٹوپی پہنے دیکھ کر جس ناگواری کا اظہار کیا' اس کا خمیازہ مجھے یوں بھگتنا پڑا کہ میرے سکول یونیفارم میں خاکی پینٹ' سفید قمیص کے ساتھ کالی ٹوپی بھی شامل تھی۔ یوں مجھے بھی سیاہ رام پوری کیپ پہننا پڑی۔ سکول میں ٹوپی نہ پہننے پر سخت سزا ملا کرتی تھی۔ ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم تھے۔ ان سے ملاقات بغیر ٹوپی کے نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے ٹوپی سے سخت نفرت تھی میں اکثر ٹوپی بستے میں رکھ دیتا۔ جونہی ضرورت محسوس ہوتی' پہن لیتا۔ ایکبار ہیڈ ماسٹر ابراہیم میرے پاس سے گزرے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب کے بجائے کہا:

"سر سے بھی ننگے پاؤں سے بھی ننگے"

میں بہت حیران ہوا کیونکہ میرے سر پر اگرچہ ٹوپی نہیں تھی تاہم میرے پاؤں میں ہوائی چپل تو تھی۔ میرے استفسار پر ایک ہم جماعت نے بتایا کہ "تم نے ہوائی چپل پہنی ہوئی تھی جو کہ پاؤں ڈھانپنے کے لئے ناکافی ہوتی ہے لٰہذا ہیڈ ماسٹر صاحب نے تمہیں پاؤں سے ننگا کہا ہے"۔

سکول میں ٹیکسٹ بک بورڈ کے نصاب کی دینیات کو بالکل برائے نام حیثیت حاصل تھی جبکہ اس کی جگہ جبری طور پر مرزا قادیانی کی کتاب "کشتی نوح" پڑھائی جاتی تھی۔ ہمارے دینیات کے استاد احمد علی تھے۔ نو ماہی امتحان میں دینیات کا سارا پرچہ کشتی نوح سے آیا جب کہ دینیات کا ۲۰ نمبر کا ایک سوال اصل کورس میں سے شامل کیا گیا۔ میں نے صرف ۲۰ نمبر کا ایک سوال کر کے باقی "کشتی نوح" والا حصہ چھوڑ دیا۔ نتیجتہً مجھے سو میں سے ۱۴ نمبر دے کر فیل کر دیا گیا جس پر میرے ابا جی نے بڑا سٹینڈ لیا۔ مرزا ناصر احمد سے بات کی گئی جس پر مرزائی مرکز حرکت میں آگیا۔ آئندہ کے لئے مسلمان

طلبہ کو "کشتی نوح" سے تو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا لیکن سکول میں قیام کی تمام مدت مجھے ماسٹر احمد علی کے عتاب اور تعصب کا نشانہ بننا پڑا۔ موصوف مجھے ہمیشہ "غیر احمدی" لڑکا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

ہماری کلاس میں مرزا رفیع کا بیٹا طیب' مرزا ناصر کا بیٹا لقمان' مرزا انور کا بیٹا احسن اور میر داؤد کا بیٹا قمر سلیمان بھی پڑھتے تھے۔ لقمان تو باپ کے خلیفہ بنتے ہی سکول چھوڑ گیا بلکہ اسے پڑھانے سکول خود چل کر قصر خلافت جاتا تھا۔ یعنی اساتذہ اسے پڑھانے کے لئے جاتے تھے۔ احسن اور قمر سلیمان نسبتاً" اچھے لڑکے تھے جبکہ طیب انتہائی متعصب لڑکا تھا۔ اسے میرے ساتھ نہ جانے کیوں خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ میرا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ماسٹر احمد علی کی طرح ہمیشہ مجھے "غیر احمدی لڑکا" کہا کرتا تھا۔ ایک روز اس کے ساتھ میری اس بات پر سخت لڑائی ہو گئی۔ میں نے کہا "تم مجھے غیر احمدی کہتے ہو حالانکہ تم خود غیر احمدی بلکہ مرزائی ہو"۔

میں نے گھر آ کر اپنے اباجی سے کہا کہ "کل سے میں نے مرزائیوں کے سکول نہیں جانا"۔ انہوں نے مسئلہ دریافت کیا اور میرے بتانے پر وہ مجھے لے کر مرزا رفیع کے گھر گئے۔ ہم محلہ دارالصدر میں واقع قصر خلافت میں مرزا رفیع کے گھر پہنچے۔ وہ خود گھر موجود نہیں تھے۔ مرزا طیب اس وقت ہمارے سکول کے ایک استاد عبدالرحمٰن اتالیق کے پاس ٹیوشن پڑھ رہا تھا۔ اسے ہماری آمد کا پتہ چلا تو وہ ماسٹر اتالیق کے ہمراہ باہر آگیا۔ اباجی نے تو اس کے خوب "لتے لیے" اور کہا "ہم سرکاری ملازم ہیں۔ مرزا قادیانی کی امت نہیں۔ نہ ہی تم لوگوں کی رعایا ہیں کہ ہم پر تمہارے نظریات لاگو ہوں گے۔ اپنے باپ کو بتا دینا کہ ہم لوگ نہ تمہارے ماننے والے ہیں اور نہ تم لوگوں سے متاثر ہیں۔ چنانچہ آئندہ میرے بچے کو "غیر احمدی" مت کہنا "غیر احمدی" تو تم ہو جب کہ اصل احمدی تو ہم ہیں۔ جو حضرت احمد ﷺ کی سچی امت ہیں۔ تم لوگوں نے مرزا قادیانی کی نسبت خود کو احمدی بنا رکھا ہے"۔

اباجی کا پارہ ذرا نیچے آیا تو ماسٹر اتالیق نے مداخلت کی اور مجھے مخاطب کرتے

ہوئے انتہائی متعصبانہ طریقے سے پوچھا "لڑکے! تم نے مجھے کبھی سکول میں دیکھا ہے؟" کہا "جناب ہزار بار دیکھا ہے"۔ کہنے لگے "تو پھر تم اپنے والد صاحب کو تکلیف دینے کی بجائے مجھ سے بات کر لیتے" میں نے کہا "میں اس بارے میں اپنے کلاس انچارج سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں۔ آپ ہمارے انچارج ہیں نہ ہمیں کوئی مضمون پڑھاتے ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے کیسے کہہ سکتا تھا"؟۔

ماسٹر اتالیق نے ابا جی کو یقین دلایا کہ ان کا پیغام مرزا رفیع کو پہنچا دیا جائے گا اور آئندہ آپ کو کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔ اگلے روز میں سکول آیا تو مجھے ہیڈ ماسٹر میاں ابراہیم نے طلب کیا اور سارا ماجرا پوچھا۔ میرے بتانے کے بعد انہوں نے نہایت شفقت سے کہا "اول تو آئندہ آپ کے ساتھ کوئی بھی لڑکا "ایسی" بات نہیں کرے گا اگر ایسا ہو تو آپ سیدھے میرے پاس آئیں گے"۔ اس کے علاوہ میرے اساتذہ کو بھی خصوصی ہدایت کی گئی کہ کلاس میں ایسا ماحول پیدا نہ ہونے دیا جائے جس سے صوفی فضل کریم صاحب کے صاحبزادے کو کوئی ذہنی اذیت پہنچے۔ اس انقلاب پر میں مسرور بھی تھا اور حیران بھی کہ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔ لیکن جلد ہی پتہ چلا کہ ابا جی کے قصر خلافت جا کر "جھوٹے خاندان نبوت" کو کھری کھری سنانے سے وہاں ہلچل مچ گئی۔ مرزائی مرکز کو اطلاع کی گئی۔ مرزا ناصر نے از خود نوٹس لے کر ہدایات جاری کیں۔ یہ ابا جی کے "نعرہ مستانہ اصل احمدی تو ہم ہیں" کا اعجاز تھا کہ ہر شخص بچھا بچھا جا رہا تھا لیکن ماسٹر اتالیق جو بعد ازاں آٹھویں جماعت میں ہمارے کلاس انچارج بنے' ان کا تعصب دو چند ہو گیا۔ وہ میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا کرتے تھے۔

اس واقعہ کے بعد کسی کو مجھے "غیر احمدی" کہنے کی جرات تو نہ ہوئی تاہم میرے کچھ بے تکلف دوست بعض اوقات میرے ساتھ "سینگ پھنسانے" کی کوشش کرتے اور اپنے نبی کی شان بتاتے ہوئے تبلیغ شروع کر دیتے تھے۔ میں کافی دیر ان کی باتیں یوں سنتا جیسے واقعی متاثر ہو رہا ہوں لیکن آخر میں جب یہ کہتا کہ "یار پیغمبر تو وقت کا خوبصورت ترین انسان ہوتا ہے تم نے اپنے "نمونے نبی" کی شکل پر کبھی غور

کیا ہے" تو ان کے منہ لٹک جاتے اور پھر وہ مرزائیوں کے روایتی حربے پر اتر آتے اور کہتے اس طرح شکل پر اعتراض تو انسانی اقدار کے منافی ہے۔ یوں وہ جذباتی گفتگو کرتے کرتے پھر سے تبلیغ کی طرف آ جاتے۔ ایک روز ایسا ہی سلسلہ جاری تھا میں ان کی خرافات کافی دیر سنتا رہا۔ وہ سمجھ رہے تھے جیسے "موم پگھل" رہا ہے۔ مگر میں نے آخر میں جب کہا "دیکھو یارو! تمہاری ساری باتیں درست ہیں مگر اس شعر کا کیا ہو گا" اس پر سب یک زبان ہو کر بولے "کون سا شعر" میں نے کہا بھئی یہ والا شعر۔

اگر مرزا ہوتا خدا کا نبی
تو "ٹٹی" میں گر کر نہ مرتا کبھی

شعر کہنے کی دیر تھی ' ان سب کی ساری چمک کافور ہو گئی ۔ ان کے یبوست زدہ چہرے دیدنی تھے۔ اس کے بعد میرے مرزائی دوست مجھے تبلیغ کرنے سے محض اس وجہ سے گریز کرتے کہ میں ان کے "نبی" کی شخصیت اور شکل پر "پھبتیاں نہ کسوں"۔

سکول میں اساتذہ کو تنخواہ انتہائی کم ملا کرتی تھی۔ وہ بے چارے ٹیوشنز اور دیگر جز وقتی ذرائع سے نہ جانے کیسے اپنے گھر چلاتے اور اس کے ساتھ چندے دے کر مرزائیت کا دوزخ بھی بھرتے تھے۔ اردو کے استاد احمد علی کی طرف سے ہمیں یہ ہدایت تھی کہ "اردو کے لئے پان کے پتے والی کاپی استعمال کی جائے" مجھے بڑی حیرت ہوتی کہ آخر اس کاپی میں کیا خاص خوبی ہے جو ماسٹر صاحب اس کے استعمال پر مصر ہیں۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ دراصل یہ کاپیاں وہ خود بناتے تھے۔

چودھری غلام رسول معاشرتی علوم پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ جغرافیہ پڑھاتے ہوئے دنیا کے نقشے سے مختلف مقامات اور ملک دکھا اور پڑھا رہے تھے۔ اچانک ہندوستان پر انگلی رکھ کر بولے "تو یہ ہے ہمارا ہندوستان" پوری کلاس یک زبان ہو کر بولی "ماسٹر صاحب! ہمارا ہندوستان نہیں ہمارا تو پاکستان ہے"۔ اس پر چودھری صاحب نے کہا "بھئی ہمارا ہندوستان کیوں نہیں 'کیا وہاں ہمارا قادیان نہیں ہے؟" لڑکے بولے "جی ہے"۔ "تو پھر ہندوستان ہمارا ہندوستان ہوا یا نہیں؟"۔ چودھری صاحب نے کہا۔

جس پر پوری کلاس نے گونج دار آواز میں جواب دیا "جی ہندوستان ہمارا ہے"۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور یہ سن کر مرزائیت پر لعنت بھیج رہا تھا۔ چودھری صاحب نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا "دیکھو بچو! قادیان واپسی ہمارا مشن اور خواب ہے۔ اس لئے ہندوستان ہمارا ہے اپنے ذہن میں یہ بات رکھو کہ ہم نے ایک دن قادیان واپس جانا ہے اور وہی ہماری منزل ہے"۔ مجھے خاموش دیکھ کر میرے ایک ساتھی نے پوچھا "تم کیا سوچ رہے ہو" میں نے کہا "میں تم لوگوں کی عقل پر ماتم کر رہا ہوں کہ تم لوگ اتنے پیارے ملک کو اپنا کہنے کے بجائے دشمن ملک کے گن گا رہے ہو"۔

ہماری کلاس میں "محمود نظامی" کا بیٹا شکیب ہارون پڑھا کرتا تھا۔ پہلے تو اس کا قیام بورڈنگ ہاؤس میں تھا بعد میں وہ اپنے گھر والوں کے ہمراہ مرزائی ہو کر ربوہ منتقل ہو گیا اور "الفیض فلیٹس" میں رہائش اختیار کی۔ شکیب فیملی کے مرزائی ہونے کی خبر قومی اخبارات میں چھپی تو پورا سکول اسے مبارک باد دینے ہماری کلاس میں آیا اور وہ یوں مبارک بادیں سمیٹ رہا تھا جیسے اس نے کوئی میدان مار لیا ہو۔ اس روز مجھے بہت دکھ ہوا کہ ایک اچھا بھلا مسلمان خاندان نہ جانے کیسے کفر کی گھاٹی میں اتر گیا ہے۔ میرے کلاس فیلو مجھے سمجھانے لگے "دیکھو شکیب ہارون اور اس کے گھر والوں نے کتنا اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں بھی غور کرنا چاہئے"۔ میں نے کہا "مجھے تو تم اور تمہارے "نبی" پر تین حرف بھیجنے چاہئیں۔ تمہارا کیا خیال ہے میں کسی کو جہنم جاتے دیکھ کر خود بھی اس کے پیچھے چل پڑوں گا۔ ہم تو کالی کملی والے کے غلام ہیں۔ ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں۔ جب تک یہ جذبہ زندہ ہے مرزا غلام احمد کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا"۔

ہمارے ایک استاد ماسٹر نذیر احمد جن کا تعلق چنیوٹ کے ایک نواحی گاؤں سے تھا' وہ کسی مرزائی ملاں کے جھانسے میں آ کر مرزائیت قبول کر بیٹھے۔ گھر والوں سے غالباً" ان کا تعلق تمام ہو چکا تھا۔ انہیں کلاس میں مرزائیت کا پرچار کرنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ ان کی شادی بھی ربوہ میں کرائی گئی تھی جس کے زعم میں وہ ہر وقت

مرزائیت کا حق نمک ادا کرنے پر تلے رہتے تھے۔ وہ ہمیں پڑھاتے تو حساب تھے' لیکن اپنے پیریڈ کے دوران کچھ نہ کچھ وقت مرزائیت بیانی پر بھی ضرور صرف کرتے تھے۔ ایک روز مرزا غلام احمد کی سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے پورا پیریڈ غارت کر دیا۔ مجھے سخت کوفت ہوتی تھی لیکن میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ دوسرے وہ میرے ساتھ براہ راست ہم کلام بھی نہیں تھے۔ اس روز میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ "مولا! اس شخص نے تیرے سچے نبی کی جگہ اپنے "جھوٹے نبی" کا درجہ بلند کرنے کی انتہا کر دی ہے۔ اس کو سخت ترین سزا دے"۔ یہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی اللہ تعالیٰ نے میری التجا سن لی اور ماسٹر نذیر کو جسم پر عجیب و غریب دانے نکلنے شروع ہو گئے' جن سے پانی نکل کر جہاں لگتا فوراً" دوسرا دانہ نکل آیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا چہرہ مکمل دانے دار اور انتہائی مکروہ ہو گیا۔

چودھری غلام رسول جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے وہ جسمانی سزا کے بہت ماہر تھے۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ سزا دینے کے لئے ماتھے کے بالوں سے پکڑتے اور زمین پر پٹخ کر گرا دیتے اور اوپر سے گھونسوں' لاتوں اور ڈنڈوں کی بارش کر دیتے۔ ان کی مار کھانے والا کئی روز تک بستر پر پڑا رہتا تھا۔ ایک روز انہیں نہ جانے کیا ہو گیا اور غصے میں اپنے جھوٹے خاندان نبوت کے ایک سپوت پر بھی طبع آزمائی کر بیٹھے۔ مرزا انور کا بیٹا مرزا احسن بہت موٹا تھا۔ اس کو کوئی سوال نہ آیا تو چودھری صاحب نے اسے مذکورہ طریقے سے گرا کر دھن ڈالا۔ وہ بے ہوش ہونے والا ہو گیا۔ گھر جا کر اس نے بتایا تو اگلے روز مرزا انور نے سکول آ کر بھری کلاس میں چودھری صاحب کی "مدر سسٹر" ون کر دی اور دو تین تھپڑ لگا دیئے۔ پوری کلاس چودھری صاحب کی بے بسی دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ مرزا انور نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ موصوف کو سکول سے نکلوا دیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ چودھری صاحب کو لاہور میں مرزائیوں کے ایک ہوسٹل "دارالحمد" کا وارڈن لگا دیا گیا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ بات قابل ذکر ہے کہ چودھری صاحب کی موصوف کی سخت ترین سزا کے باوجود ہمارے سکول میں ایک نام نہاد اصول کے تحت

بڑی سے بڑی سزا ۶ ڈنڈے تھی۔

ہمارے سکول میں بعض اچھے استاد بھی تھے جن میں سید سعادت علی شاہ صاحب اور عبدالرب صاحب شامل ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں مشہور تھا کہ دونوں "نیم مرزائی" ہیں۔ شاہ صاحب فزکس کیمسٹری اور ریاضی پڑھاتے تھے۔ ان کا طرز تکلم جتنا سخت تھا' دل کے وہ اتنے ہی نرم تھے۔ لڑکے ان کے طرز تدریس سے بہت خوش تھے۔ شاہ صاحب ۶۹ء کے بعد مرزائیت ترک کر کے مسلمان ہو گئے۔ جبکہ عبدالرب صاحب جو ہمیں ساتویں سے دسویں تک انگریزی پڑھاتے رہے وہ بھی بڑے نرم خو تھے۔ مجال ہے جو کلاس میں مرزائیت کے بارے میں ایک لفظ بھی کہہ جائیں۔ تاہم ان کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ ابھی تک مرزائیت کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں یا نکل چکے ہیں۔

۱۹۶۵ء کے ہی آخری مہینوں میں مرزائی خلیفہ مرزا محمود احمد کا انتقال ہو گیا تو سکول کالج غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیے گئے۔ شہر میں مرزائیوں کا میلہ لگ گیا۔ دنوں تک میت کا دیدار کیا گیا۔ مرزائی لڑکے دعویٰ کرتے تھے کہ "دیدار" کرنے سابق صدر ایوب خان بھی آئے تھے۔ جھوٹی نبوت کے اس ستون کو ربوہ کی خود ساختہ جنت میں منوں مٹی تلے دفن کر کے جب دوبارہ سکول کھلے تو کلاس کے بے تکلف لڑکوں نے مجھے کہا "دیکھا ہے مقام' ہمارے حضور کا' کتنی دنیا ان کا دیدار کرنے آئی' اگر ہمارے خلیفہ صاحب سچے نہ ہوتے تو انہیں یہ مرتبہ کیسے عطا ہوتا۔ اب بھی مان لو"۔ میں ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اپنی رائے ہمیشہ کی طرح محفوظ رکھی اور نہایت مختصر سا جملہ کہا "اوئے مرزے نوں دب آئے او" میرا یہ کہنا تھا کہ چند لمحے پہلے مسکرانے والے ان لڑکوں کے چہرے غصے سے تمتما اٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد یہ بات "ٹاک آف دی سکول ہو گئی"۔ اساتذہ سمیت کئی طلبہ نے مجھ سے استفسار کیا جس پر میں نے کہا کہ "کوئی غلط بات نہیں کی گئی ہماری بولی میں جب کسی شخص کو دفن کر دیا جائے تو ہم یہی کہتے ہیں "دب آئے آں" اس پر میرے اساتذہ نے مجھے سمجھانے کے انداز

میں کہا کہ "آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ انہیں سپرد خاک کر دیا گیا ہے اور پھر اتنے عظیم انسان کے لئے تو اچھے کلمات استعمال کرنے چاہئیں"۔ میں نے کہا "آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے لیکن موصوف میرے لئے عظیم نہیں تھے بلکہ ایک عام شخص تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے لئے عام بات کہہ دی"۔ وہ لوگ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ یوں بظاہر بات دب گئی مگر بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چھٹی کے بعد مجھے مارنے کا باقاعدہ پروگرام بن گیا تھا۔ لیکن سکول انتظامیہ نے روک دیا تھا۔

گھر آیا تو والد صاحب نے مجھ سے ساری صورت حال پوچھی اور کہا "بات تو تم نے سچ کی ہے مگر ذرا محتاط رہا کرو۔ یہ لوگ انسان نہیں بھیڑیے ہیں"۔ بعد ازاں ابا جی کو سکول بلا کر ہیڈ ماسٹر ابراہیم نے کہا کہ "آپ اپنے بچے کو سمجھائیں کہ وہ اس قسم کی متنازع بات نہ کیا کرے جس سے لڑائی جھگڑے کا خطرہ ہو "ابا جی نے کہا آپ لوگ بھی یہ جو دعوت تبلیغ "تلی" پر لئے پھرتے ہیں' اس سے گریز کیا کریں۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہمارے ایک استاد بشیر احمد جغرافیائی حالات پر لیکچر دے رہے تھے۔ بات بھارت کے متعلق چل نکلی تو وہ کہنے لگے "بھارت ہمارے' لئے پاکستان سے زیادہ اہم ہے۔ وہاں قادیان ہے جس میں ہمارے "نبی" دفن ہیں۔ اور ہمیں ایک دن وہاں لوٹ کر جانا ہے"۔ اس کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا "ہمارے خلیفہ اور دیگر مشاہیرن کو ربوہ میں امانتاً" دفن کیا گیا ہے جنہیں بعد ازاں قادیان لے جایا جائے گا"۔ اس پر انہوں نے اپنے خلیفہ مرزا محمود احمد کی ایک تقریر کا حوالہ بھی دیا جس میں کہا گیا تھا کہ "ملکی تقسیم غلط طریقے سے ہوئی ہے۔ ہم اس تقسیم کو ختم کرانے اور پاک بھارت کے باہمی افتراق دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے گا اور ہندوستان اور پاکستان کو پھر سے اکھنڈ بھارت بنا دیا جائے گا"۔

چلتی پھرتی لائبریری

ربوہ میں آئے ہوئے کئی مہینے گزر جانے کے باوجود میں شہر کے بیشتر راستوں سے نابلد تھا۔ ہمارا بیلدار طالب حسین مجھے سائیکل پر چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ اس کی فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے کلاس روم میں چھوڑتا اور وہیں سے واپس لے آتا۔ اس کے علاوہ ابا جی ہمیں گھر سے باہر نکلنے بھی نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ہمارے دونوں بیلدار متھیلا اور طالب حسین چھٹی پر تھے۔ مجھے سکول پیدل جانا پڑا۔ یہ دن میرے لئے بڑا مشکل تھا۔ میں گھر سے نکلا اور جدھر لڑکے جا رہے تھے، چلتا گیا اور بالآخر سکول پہنچ گیا۔ اس روز کے بعد ابا جی نے فیصلہ کیا کہ میں پیدل سکول جایا کروں۔ میں نے اس کے لئے راستے میں آنے والے مخصوص نشان و علامات اور مکان یاد کرنے شروع کر دیئے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے بہت جلد سکول کا راستہ یاد ہو گیا۔ گھر سے نکلتا تو گلی کے پہلے موڑ کے بعد ایک گھر پر غلام رسول راجیکی کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس کے بعد چودھری فرزند علی کا گھر پھر اسامہ کاٹیج اور آشیانہ کے پاس سے گزرتے ہوئے کچا بازار آ جاتا۔ یہاں سے مسجد اقصیٰ کی ملحقہ پہاڑی کی طرف سڑک مڑتی اور آگے ایک مکان پر جلی حروف میں ''مرزا غلام احمد'' کا ایک الہام ''مرزا غلام احمد کی جے'' تحریر تھا۔ اس کے ساتھ ہی جامعہ احمدیہ تعلیم الاسلام سکول اور تسلیم الاسلام کالج تھے۔

چند روز کی مشق کے بعد راستہ یاد ہو گیا۔ بعد ازاں میں نے راستہ تبدیل کر کے ریلوے لائن کے کنارے کنارے آنا جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں صبح کے وقت ریڈیو پر ٹیسٹنگ کے طور پر تلاوت لگتی تھی۔ قاری صاحب جب لمبی آیات تلاوت کر کے سانس لیتے تو سامعین ''اللہ اللہ'' کہا کرتے تھے۔ اس کو سن کر ہمارے سکول میں اسمبلی کے دوران جب تلاوت ہوتی تو لڑکے اللہ اللہ کہنا شروع کر دیتے۔ اس پر ہمارے سیکنڈ ماسٹر چودھری غلام رسول کی طرف سے سخت سرزنش ہوئی۔ ان کا موقف

تھا کہ اس طرح "اللہ اللہ" کہنا بدعت ہے۔ لیکن لڑکے ان کی نصیحت کے باوجود باز نہ آئے تو چودھری غلام رسول نے ڈنڈے سے اسمبلی میں شریک تمام لڑکوں کی اس قدر دھنائی کی کہ وہ اللہ کا نام لینا چھوڑ گئے۔ مرزائی اساتذہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ کا ذکر جلی طور پر کرنا بدعت ہے۔ چنانچہ اس بدعت کی شدت سے مخالفت کی گئی۔

ایک بار ہماری کلاس چھٹی سی میں دو لڑکے آپس میں لڑ پڑے۔ لڑتے لڑتے دونوں مجھ پر گر پڑے۔ ایک نے دوسرے کو بازو پر کاٹ لیا لیکن اس کا "چک" اس کے حریف کے بازو پر لگنے کے بجائے میرے بازو کا قیمہ بنا گیا۔ میں تو بے ہوش ہو گیا۔ اگلے روز ابا جی سکول آئے اور اسمبلی میں "چک" دکھا دیا۔ اس وقت تو لڑکوں کو سزا اور والد صاحب سے معافی مانگ لی گئی لیکن بعد میں استاد چہ میگوئیاں کرتے رہے۔

"ایس منڈے نوں تے کنڈا وی لگ جاوے تو اینڈا پیو مصیبت پا دیندا ہے"

ربوہ شہر میں کئی عجیب و غریب لوگ تھے جس میں مرزا منور کا بیٹا مرزا مظہر عرف میاں مجو قابل ذکر ہے۔ اس کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ انتہائی فربہ مرزا مظہر ہاتھوں میں اخبار' بغل میں کتابیں اور منہ میں پان رکھے شہر میں گھومتا رہتا تھا۔ اس کے شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر ہوتے جب کہ ایک ہاتھ میں چھڑی ہوتی تھی۔ لوگ اسے مذاقاً" چلتی پھرتی لائبریری کہا کرتے تھے۔ جونہی کوئی اسے لائبریری کہتا' مرزا مظہر کے منہ سے گالیاں اور کف برسنا شروع ہو جایا کرتا تھا۔

ہماری کلاس میں ایک لڑکا جمال الدین تانگے والا بھی پڑھتا تھا جو سکول کے اوقات کے بعد تانگہ چلایا کرتا تھا۔ کئی بار وہ اپنا تانگہ سکول میں ہی لے آتا اور جونہی چھٹی ہوتی' ایک لحہ ضائع کئے بغیر وہ اپنا تانگہ لے کر دھندے پر نکل جایا کرتا تھا۔ مجھے اسے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی کہ بیچارہ پڑھائی کے ساتھ محنت مزدوری بھی کرتا ہے مگر بعد میں پتہ چلا کہ جمال دین کے والدین نہایت تنگدست تھے۔ جمال الدین اپنے گزر بسر کے علاوہ چندے کی بھرمار سے نبرد آزما ہونے کے لئے تانگہ چلایا کرتا تھا۔

ربوہ میں مسلمان سرکاری ملازمین کی تعداد بہت کم تھی۔ ہمارے علاوہ وہاں

دوست محمد ٹیلیفون سپرنٹنڈنٹ ' لائن مین محمد شفیع' مولا بخش ڈاکیا اور سٹیشن ماسٹر شیخ مختار رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شیخ مختار کے بیٹے اسرار کو مسجد سے ٹونٹیاں اتارنے کے الزام میں مرزائیوں کے نام نہاد تھانے میں ڈال دیا گیا۔ شیخ مختار بہت پریشان ہوئے اور ابا جی سے مدد طلب کی۔ ابا جی شیخ صاحب کو لے کر مرزا منصور کے پاس گئے اور ان کی طبیعت صاف کر کے رکھ دی۔ مرزا منصور ابا جی کو پیر جی کہا کرتے تھے۔ ابا جی نے ان سے کہا "مرزا صاحب! پہلے ہی آپ کے کفرستان میں کوئی مسلمان ملازم آنا پسند نہیں کرتا اور شامت اعمال سے اگر کوئی آ جاتا ہے تو آپ اس کو جھوٹے الزامات کے ذریعے تنگ کرتے ہیں۔

مرزا منصور نے کہا "پیر جی! کیا خطا ہو گئی ہے جو جناب کا پارا آسمان تک پہنچا ہوا ہے؟"

ابا جی نے کہا "مسجد سے ٹونٹیاں آپ کے ان امتیوں نے اتاری ہیں' جن سے چندے لے لے کر آپ لوگوں نے انہیں "پھانک" کر رکھا ہے اور الزام آپ نے ایک مسلمان سرکاری ملازم کے بچے پر لگا دیا ہے۔ آپ فوری طور پر "اسرار" کو اپنی پراسرار حراست سے آزاد کریں"۔

مرزا منصور نے مسکراتے ہوئے اپنے دربان کو حکم دیا "میاں جلدی کرو اس لڑکے کو رہا کراؤ ورنہ پیر جی کچھ کر ڈالیں گے"۔

ربوہ شہر میں ریلوے اسٹیشن' گول بازار کے پھاٹک اور دار ضیافت کے پہلو میں ایک کچا کمرہ ہے جس کی بنیادیں انتہائی پکی ہیں۔ یہ وہ کمرہ ہے جہاں قیام پاکستان کے بعد ربوہ آنے پر مرزا محمود احمد نے قیام کیا تھا۔ اس یادگار کمرے کو پرستش کا مقام دے دیا گیا ہے۔ لوگ زیارت کے طور پر یہ کمرہ دیکھنے جاتے ہیں لیکن "مرزائی امت" کے پیشواؤں' پیروکاروں اور علمبرداروں کی تضاد فکر ملاحظہ ہو۔ اس کمرے کے اردگرد کوئی امیر و کبیر خاندان مقیم نہیں بلکہ یہاں تیسرے درجے کے "کمی کمین" لوگ رہتے ہیں جن میں ہمارا ایک کلاس فیلو محمود احمد شمس عرف پوپو بھی رہتا تھا۔ جس کی والدہ کے

ساتھ ایک افریقی مبلغ نے شادی کی اور کئی بچوں کی شکل میں اسے مرزائیت کا داغ دے کر بھاگ گیا۔ وہ بیچاری بچوں کا ایک "ترنڈ" لے کر "اپنے نبی کے یادگار کمرہ" کے قرب میں مرزائیت کا ماتم کرتی تھی۔

ربوہ میں کئی دلچسپ کردار گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ ایک شخص جسے "درمٹ" کہا جاتا تھا' وہ پورے شہر کے لوگوں کے آوازے سنتا اور جواباً" ان پر گالیاں اور سنگ و خشت برسایا کرتا تھا۔ یہ نیم پاگل قسم کا انسان تھا جسے ربوہ کے مکینوں نے مکمل پاگل کر دیا تھا۔ نبوت کے "تخت نشینوں کو کبھی بھول کر بھی اس شخص کے بارے میں خیال نہیں آتا تھا۔ حالانکہ صحت مندی کی حالت میں وہ بہت اچھا پینٹر تھا اور بھٹی پینٹر کے نام سے مشہور تھا۔

ایک اور ڈاڑھی والا "الٰہی بخش" بھی تھا۔ پورے شہر میں وہ آگے اور لڑکے بالے اس کے پیچھے پیچھے "پاگل پاگل" کا شور مچاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی جیبوں میں کلغذوں کے چیتھڑے' ہاتھوں میں روڑے اور زبان پر "پھکڑ" ہوتے جو وہ اپنی مرزائی امت کے نونہالوں پر برساتا تھا۔ ان نونہالوں پر جنہیں مرزا محمود احمد نے کچھ کہنے کے لئے کلام محمود تصنیف کیا تھا۔ قصر خلافت کے ارد گرد ایک اور دیوانہ شخص ہوتا جس کا نام مجھے یاد نہیں۔ کہتے ہیں بچپن میں اس کی ایک پالتو بطخ بس کے نیچے آ گئی۔ اس نے روتے ہوئے اپنی ماں سے کہا "ماں بطخ لوٹ پوٹ" بس یہی بات اس کی چھیڑ بن گئی جس نے اسے دیوانہ بنا ڈالا۔

ربوہ میں لوگوں کے نام بھی عجیب و غریب ہوا کرتے تھے۔ عربوں کی نقالی میں یہ لوگ فرنچ کٹ داڑھی کی طرح نام بھی ان جیسے رکھا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ہمارے گھر کے قریب ایک مولوی صاحب رہتے تھے جنہیں "مولوی پاوا" کہا جاتا مگر ان کا اصل نام ابوالمنیر نورالحق تھا۔ ایک شخص کا نام سراج الدین حبیب اللہ طارق تھا جبکہ ہمارے ایک کلاس فیلو کا نام آفتاب منیر احمد تھا۔

ربوہ میں ایک شخص عزیز راجیکی تھا جس کی وضع قطع دیکھ کر میں بہت حیران

ہوتا تھا۔ انتہائی لمبے قد کا بھاری بھرکم شخص سفید تہبند اور کرتہ پہنا کرتا تھا جبکہ اس کے سر پر بہت بڑی سی سفید پگڑی ہوتی جس میں اس کا بڑا سا چہرہ چھپ کر رہ جاتا۔ سکھوں کی طرح ڈاڑھی اور مونچھوں نے اس کے ہونٹ بھی چھپا رکھے تھے۔ کہا جاتا کہ یہ "مرزا غلام احمد" کے صحابی مولوی غلام رسول راجیکی کا بیٹا ہے۔ اس شخص کا مسلک "سدومیت" سے بڑا گہرا تعلق تھا اس کے جلو میں ہر وقت شہر کے "نوخیز امرد" گھوما کرتے تھے جن میں ملک خدا بخش ہرل تھانیدار کا بیٹا قابل ذکر ہے۔

ربوہ کے اکثر لوگ ایک بات بڑی عقیدت سے سنایا کرتے تھے کہ ایک بار ان کے "مرزا غلام احمد" پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی برسات ہوئی تو مولوی نورالدین اور مرزا محمود احمد اور مرزا بشیر احمد ایم۔ اے نور کی اس میگھا میں بھیگ گئے۔ بعد میں یہی برسات ایک بار مرزا محمود احمد پر ہوئی تو انہوں نے برستی برسات میں مرزا ناصر' ڈاکٹر مرزا منور' مرزا مبارک' مرزا طاہر اور مرزا رفیع کو بلا لیا۔ جب یہ لوگ نور سے پوری طرح سیراب ہو گئے تو بھی نور کا مینہ برستا رہا۔ پھر چودھری ظفراللہ خان کو بلایا گیا چنانچہ وہ بھی خدائی نور سے منور ہو گئے۔ مجھے یہ سن کر حیرانگی ہوتی کہ بھوک کے مارے اور پیسوں کو ترسے ہوئے یبوست زدہ مرزائی نہ جانے کس زعم یا مجبوری کے تحت ایسی خرافات سنتے' ان پر ایمان لاتے اور پھر ان کا پرچار کیا کرتے تھے۔

ربوہ سے سرگودھا جائیں تو لالیاں اور ۴۶ اڈے کے درمیان ایک ۵۸ چک ہے جس کو "چک قصائیاں" کہا جاتا ہے۔ یہ چک درحقیقت جسم فروشی کا اڈہ ہے جس کو اگر دیہی بازار حسن کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ہم جب سکول و کالج میں پڑھا کرتے تھے تو اکثر مرزائی لڑکے ایک دوسرے کو کہتے "چلو شکار کے لئے چک قصائیاں چلیں" تب میں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ شاید پرندوں کے شکار کے لئے کسی گاؤں جانے کی بات کرتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کیا ہے یہ چک مرزائیوں نے اپنی تسکین کے لئے آباد کر رکھا تھا۔ دروغ بر گردن راوی ہمارے ایک مرزائی کلاس فیلو جس کا نام قصدا" یہاں لکھنا مناسب نہیں' مجھے بتایا تھا کہ ماضی کی ایک اداکارہ ناصرہ کے بارے

میں کہا جاتا ہے کہ وہ ربوہ کے محلہ فیکٹری ایریا کے کسی تحصیلدار کی بیٹی تھی۔

جس زمانے کی یہ باتیں ہیں' تب ربوہ کی درس گاہوں کو مثالی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے اور اس زمانے کے ربوہ سے فارغ التحصیل طلباء یہ بات بڑے وثوق سے بتا سکتے ہیں کہ ربوہ میں تعلیم کا معیار ملک بھر کے باقی تعلیمی اداروں جیسا ہی تھا۔ کوئی تخصیص نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ جنسی تعلیم عام تھی۔ وقت سے پہلے ہر لڑکا وہ باتیں سیکھ جاتا تھا جو زندگی سنوارنے کی بجائے تباہ کر دیا کرتی ہیں۔ سکول و کالج کے ہوسٹل تو "جنسی انسٹی ٹیوشن" تھے جہاں لڑکے لڑکیوں کو "گے اور لزبین" کلچر کی تعلیم کے علاوہ تربیت بھی دی جاتی تھی۔ لیکن ہوش و خرد سے عاری والدین نہ جانے کیوں اپنے بچوں کو گھروں سے دور جنسی درندوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ جامعہ نصرت کالج اور سکول کی لڑکیاں ہوسٹل کے بند دروازوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دیواریں پھاند کر جہاں مرضی ہو چلی جاتی اور خوش وقت ہو لیا کرتی تھیں۔ بلکہ بتانے والے بتاتے ہیں لڑکیوں کے ہاسٹل کے دروازے قصر خلافت کے دروازوں کے آمنے سامنے رکھنے کے بھی کئی مقاصد ہیں۔

ربوہ میں بھونڈی نہایت تیاری سے کی جاتی تھی۔ لڑکے ٹیڈی پتلونیں پہن کر سائیکلوں پر شہر کی سڑکوں پر گھومتے اور سیاہ برقعوں میں ملبوس حوروں کو آنکھوں سے اشارہ کرتے۔ اگر بات بن جاتی تو ریل گاڑی میں بیٹھ کر چنیوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر چلے جاتے۔ یہاں انہیں دوسری طرف سے آنے والی ٹرین کی آمد تک کافی موقع مل جاتا۔ اس کے علاوہ چنیوٹ سرگودھا اور لائل پور کے سینما گھر "ڈیٹ" کے لئے بہترین مقامات تھے۔

"مرزائی مت" کے پیروکاروں کو "شیعہ مسلک" سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ یہ اپنے خاص خاص فنکشن خاص طور پر محرم کے ایام میں رکھا کرتے تھے۔ شادی بیاہ کی بیشتر تقاریب دسویں محرم کو ہوا کرتی تھیں۔ ان بدبختوں کا اس بارے میں موقف یہ تھا

کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی یزید کے ساتھ جنگ سیاسی تھی اور ایک نافرمان کے حاکم وقت کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر افسوس کرنا پرلے درجے کی بے وقوفی ہے۔ ہمارے سکول میں دسویں جماعت کی الوداعی پارٹی بھی دسویں محرم کو ہوئی جس میں ہم لوگوں نے احتجاجاً شرکت نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ ماتم اور مجالس عزا اور بالخصوص مجلس شام غریباں کا ربوہ میں زبردست مذاق اڑایا جاتا تھا۔ چمن عباس' چنیوٹ اور احمد نگر میں تعزیہ اور ذوالجناح کے جلوس نکلتے تو خدام الاحمدیہ کے شیر جوان خاص طور پر وہاں بھونڈی کرنے کے لئے جاتے اور اگلے روز اپنی خباثت کے قصے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے جلسہ سالانہ پر ان کی حوریں "اڑانے" کے لئے باہر سے ربوہ میں کون کون آتا تھا لیکن وہ یہ نہیں سوچتے تھے کیونکہ ورثے میں ملی ہوئی بے غیرتی کے باعث شرم اس امت سے کوسوں دور تھی۔

ایک مرزائی مبلغ جو پہلے سکھ تھا' بعد میں بھی خود کو "گیانی" ہی کہلواتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے اور میرے چند دوستوں کو کہا کہ آپ لوگوں کو ابھی تک "احمدیت" کی تبلیغ کسی نے اچھے طریقے سے کی نہیں۔ اس لئے آپ "مرزا غلام احمد" کی تعلیمات کو سمجھ نہیں سکے۔ لہٰذا آج میں آپ کو بتاتا ہوں کہ "احمدیت" کیا ہے۔ ہم خاموش اور ہمہ تن گوش ہو گئے اور دل میں سوچ لیا کہ "مرزائی مت" کے اس علمبردار کی مت مار کر ہی رہیں گے۔ ہمارے بزرگ دوست چودھری غلام رسول آف سرگودھا نے اس بد بخت کی تمام باتیں سن کر کہا "بابا جی! آپ کی عمر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہاتھ کی بجائے صرف زبان سے بات ہو سکتی ہے۔ لہٰذا سنو! تمہارا جھوٹا نبی اگر کسی جھوٹے پیر کے طور پر اہل روحانیت کا دعویٰ کرتا' ہم قبول کر لیتے۔ کیونکہ ملک بھر میں بے شمار "ڈبے پیر" موجود ہیں لیکن اس نے تو لمبی چھلانگ جا لگائی اور "نبی بن بیٹھا" تو بابا جی ہم اسے کیسے مانیں۔ اور تم تو مرزائی ہونے کے بجائے سکھ رہتے تو زیادہ اچھا تھا کم از کم کسی ٹھوس مذہب پر تو قائم تھے۔ چودھری غلام سول کی باتیں سن کر "بڈھا سکھ" لمبی سی "ہوں" کر کے رہ گیا۔

بے وفا دوست سے کے ٹو سگریٹ اچھا

ازل سے آج تک دنیا کے ہر معاشرے میں تین قوتوں کی حکمرانی رہی ہے جن میں حکام' مذہبی اکابرین اور طبیب شامل ہیں۔ تینوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ مذہبی اکابر حکام کی ہر سچی جھوٹی بات کی تائید کر کے انہیں من مانی کا موقع دیتے ہیں جبکہ حکام اہل مذہب کو مالی امداد فراہم کرتے ہیں اور طبیب دونوں فریقوں کو جسمانی' ذہنی اور جنسی طور پر صحت مند رہنے کے لئے نسخے اور کشتے مہیا کرتے ہیں۔ انگریز کو ہندوستان پر پورا تسلط حاصل ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں سے ہمیشہ خطرہ رہا ہے۔ خود کو مضبوط کرنے اور مسلمانوں میں دراڑیں ڈالنے کے لئے اس نے جب کسی مذہبی حوالے اور دھڑے کی شدت سے ضرورت محسوس کی تو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی بنا کر لا کھڑا کیا۔ ان دونوں قوتوں کو شیطان دوستی میں مزید آگے لے جانے کے لئے بھیرہ نژاد حکیم مولوی نورالدین نے اپنی تمام تر ذہنی اور طبی صلاحیتیں صرف کر کے ایک مرزائی معاشرے کو جنم دیا۔ مرزائیت کے قیام کو دوام بخشنے کے لئے مرزا غلام قادیانی اس کے برگ و بار اور خلفاء کو مرزائی علماء نے دلائل و براہین سے سچا ثابت کیا اور انگریز سے دولت کے ڈھیر سمیٹے جب کہ ان دونوں حلقوں کی ذہنی' جسمانی اور جنسی آبیاری کے لئے **طبیبوں** اور ویدوں کے ٹولے نے اپنی اپنی خدمات انجام دیں۔ ربوہ شہر میں دیسی علاج کرنے والے حکماء کی بکثرت دکانیں ہیں۔ کہنے والوں کے مطابق حکیم نورالدین کا مرزائی خاندان نبوت اور امت پر بڑا احسان ہے۔ اس کی ادویہ نے "مرزا غلام احمد کی ڈھلتی ہوئی جنسی قوتوں کو سنبھالا دیا اور نسخہ "زوجام عشق" کے زور سے مرزا محمود احمد اور مرزا بشیر احمد ایم۔ اے پیدا ہوئے۔

گول بازار میں دواخانہ خدمت خلق' دواخانہ حکیم نظام جان اور خورشید یونانی دواخانہ بہت بڑے دیسی ادویہ کے مراکز ہیں۔ اس کے علاوہ شہر میں کئی چھوٹے چھوٹے

مطب بھی موجود تھے۔ جن میں حکیم رانجھا اور حکیم عبدالحمید سنیاسی کا مکتبہ فیض عام بہت مشہور تھے۔ کھلنڈرے لڑکے اکثر "فیض عام کو قبض عام" کہہ کر حمید سنیاسی کو چھیڑتے اور مادر و خواہر کی مغلظات سنا کرتے تھے۔

مذکورہ دواخانوں میں زیادہ تر قوت مردی میں اضافے کی ادویہ فروخت ہوتی تھیں۔ ہر دوسری دوا پر "نسخہ حضرت خلیفہ اول" تحریر کر دیا جاتا جس کی کشش سے دوا کی خریداری میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ "مرزا غلام احمد" کے بارے میں مشہور ہے کہ ان پر جنسی قوت بڑھانے کا خبط سوار تھا۔ ان کی تقلید میں مرزائی امت کے مرد بھی ہر وقت جنسی کمزوری دور کرنے اور قوت مردی بڑھانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ یہ انہی نسخوں کا ہی اعجاز و اکرام ہے کہ مرزائی تعداد ازدواج اور کثرت اولاد کے دل دادہ ہیں۔ حکماء کا خاصہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی "بم" قسم کا نسخہ تیار کرتے ہیں تو پہلے خود استعمال کرتے ہیں۔ اسی بناء پر دواخانہ خدمت خلق کے حکیم بشیر اور دواخانہ نظام جان کے حکیم نذیر کے گھروں میں بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ دیگر حکماء بھی اپنے اپنے کشتوں کی برکت سے خاصے عیال دار تھے۔ جنسی ادویہ کے علاوہ نور کاجل' محبوب کاجل اور سرمہ نور بھی مولوی نورالدین کے نسخے قرار دیے جاتے اور ان سے چاندی حاصل کی جاتی۔ حکیم نذیر کی پیٹ درد کے لئے تیار کی گئی دوا "ہاضمون" بہت مشہور تھی۔ جس کے لئے انہوں نے ایک نظم بھی لکھی تھی۔

ہاضمون کیا خوب دوائی
ربوے وچ حکیم بنائی

بڑے بڑے مگرمچھ قسم کے حکماء کو "مرزائی خاندان" کی سرپرستی حاصل تھی لیکن نچلی سطح کے طبیب نہایت تنگ دست تھے۔ جنہیں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے۔ حکیم صدیق نے اباجی سے اپنی کسمپرسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا "ہم پر تو کوئی ایسا عذاب الٰہی نازل ہے کہ کسی کو مفت دوا دیں تو فوراً" آرام آ جاتا ہے لیکن مول دوا لینے والوں کو معمولی افاقہ بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو لوگوں کو دوا کی

قیمت واپس کرنی پڑتی ہے۔ بڑے حکیموں کے بھی اکثر نسخے ناکام تھے۔ مگر ان کا "کلا" بہت مضبوط تھا۔ دواخانہ خدمت خلق والوں کا کیل مہاسوں سے نجات دلانے والا "بیوٹی لوشن" انتہائی خطرناک تھا۔ ایک بار ایک خاتون نے استعمال کیا تو وہ خطرناک الرجی کا شکار ہو گئی جو بمشکل اور بسیار ڈاکٹری علاج سے ٹھیک ہوئی مگر اس کے چہرے پر نشان عمر بھر موجود رہے۔

جہاں ربوہ میں ایک طرف "حکیم راج" تھا تو دوسری طرف زچہ بچہ کے بھی کئی چھوٹے بڑے کلینک کھلے ہوئے تھے۔ جنہیں عطائی قسم کی دائیاں چلاتی تھیں۔ دو کلینک بہرحال بڑے اور مشہور تھے۔ جن میں ایک "اقبال زنانہ دواخانہ" تھا جو محلہ دارالرحمت وسطی میں کچے بازار اور پرائمری سکول کے قریب واقع تھا۔ ربوہ میں طبقاتی فرق ملک بھر میں سب سے زیادہ تھا جس کی بناء پر اعلیٰ درجے کے گھرانوں کی خواتین تو اپنے زچگی کے مراحل بڑے شہروں کے بڑے ہسپتالوں میں سر کیا کرتی تھیں۔ درمیانے' سفارشی اور منہ لگے طبقے کی خواتین کے لئے فضل عمر ہسپتال میں بھی مراعات و سہولیات میسر تھیں۔ لیکن نچلا اور تیسرے درجے کا طبقہ بہرحال روایتی دائیوں اور مذکورہ دواخانوں کے سہارے چلتا تھا۔ ان دواخانوں میں زچگی کے امور کے علاوہ اسقاط حمل کے کیس بھی نمٹائے جاتے تھے۔ اقبال زنانہ دواخانہ کی مالک رضیہ اقبال اپنے بیٹے کی معاونت سے یہ کلینک چلا رہی تھی۔ اس کے بیٹے کی رحمت بازار میں جوتوں کی دکان "نعیم پمپی ہاؤس" تھی۔ اس کے علاوہ گول بازار کے ریلوے پھاٹک سے ملحقہ پہاڑیوں کے دامن میں ایک مختاری دائی کا میٹرنٹی ہوم تھا۔ یہاں بھی خواتین اپنے زچگی کے مراحل سے گزرتی تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے بالا بلند اور نام نہاد شرفاء شبینہ مشاغل سے پیدا ہونے والے مسائل کے ازالہ کے لئے بھی ان **کلینکوں** سے رجوع کرتے تھے۔ دارالرحمت وسطی میں ہمارا ایک کلاس فیلو صابر علی رہتا تھا۔ سیاہ رنگ کا یہ مرزائی بے زار انسان باتیں کھری کھری کرتا تھا۔ اس نے رضیہ اقبال کے بارے میں بتایا کہ موصوفہ اگرچہ ایک غیر مستند دائی ہے لیکن قادیان کی

ظلی نبوت کی پیداوار کی تختہ مشق بنائی ہوئی "امتی" عورتوں کی مشکلات بہرحال آسان کر دیا کرتی ہے۔ اس کے بدلے میں اِس نام نہاد ڈاکٹرنی کو ستم رسیدگان سے فیس اور "اوپر والوں" سے انعام بھی ملتا ہے۔

طلاق ربوہ میں جس قدر عام تھی' اس کی مثال کسی اور معاشرے میں بہت ہی کم ملتی ہے۔ یہاں مرد اور عورتیں دونوں طلاق کو مرضی کے مطابق استعمال کر لیتے تھے۔ ہمارے سکول کے ایک ٹیچر اسماعیل صاحب کے فلاسفی کے پروفیسر بیٹے مبارک احمد کی شادی ہوئی تو سہاگ رات کو ہی لڑکی نے لڑکے کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا اور اگلے ہی روز دونوں میں طلاق ہو گئی اور اسی ہفتے دونوں کی نئی شادیاں کر دی گئیں۔ طلاق کے بعد خواتین میں عدت گزارنے کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنی منکوحہ افتخار بیگم کو محض اس بناء پر طلاق دے دی کہ اس کو کسی اور لڑکی سے محبت تھی جبکہ اس کا باپ اس لڑکی کو صرف اپنے اغراض و مقاصد کے لئے "بہو" بنا کر لانا چاہتا تھا۔ اس شخص نے اپنی منکوحہ کو طلاق کے ساتھ تحریر کئے جانے والے خط میں لکھا "ہمارے معاشرے میں سسر کا بہو کے ساتھ تعلقات استوار کر لینا معمول کی کارروائی ہے۔ لہٰذا میں آپ کو اپنے باپ کے چنگل سے بچانے کے لئے طلاق دے رہا ہوں" یہ واقعہ بھی محلہ دارالرحمت شرقی کی ایک مکین لڑکی سے پیش آیا۔

طلاق اور خلع کے معاملات کو حل کرنے والی ربوہ کی متعلقہ انتظامیہ کا خاصا ہے کہ وہ ایک ہی نشست میں طلاق کا فیصلہ کر دیتی اور کھڑے پاؤں لڑکی اور لڑکے کے لئے نئے رشتے تجویز کر دیتی جنہیں فریقین اکثر قبول کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کے مضر اثرات کو محسوس کیا جاتا اور نہ ہی اس سے بچاؤ کے لئے عملی اقدام کیے جاتے تھے۔

اکثر مرزائی عورتیں شوقیہ طلاق بھی لے لیتی تھیں۔ ایسی کئی مثالیں دیکھی گئی ہیں۔ ایک شخص عبدالواسع کی بہن نے جب کسی ٹھوس وجوہ کے بغیر طلاق لے لی تو

ہمارے ایک کلاس فیلو محمود نے اس بارے میں بتایا کہ مذکورہ خاتون ازدواجی بندھن کی قائل نہیں تھی۔ اس نے گھر والوں کے مجبور کرنے پر شادی کی اور ایک "بچہ" حاصل کرنے کے بعد شوہر اور سسرال سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ محمود کے مطابق ربوہ سے وابستہ اکثر تعلیم یافتہ خواتین میں یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ صرف بچہ حاصل کرنا چاہتی ہیں تاکہ معاشرے میں ان سے "تنہا عورت" کا لیبل اتر جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ کسی بھی عام شخص سے شادی کر لیتی ہیں اور مقصد حاصل ہوتے ہی کسی بھی بات کو جواز بنا کر نجات حاصل کر لیتی ہیں۔

ربوہ میں طلاقوں کی ایک اور وجہ بھی ہے جس پر مرزائی بے زار افراد کی اکثریت پوری طرح متفق ہے۔ ان لوگوں کے مطابق مرزائی امت کے مرد حضرات اپنے پیشوا اور اس کی آل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے "سدومیت" کے اس قدر رسیا ہیں کہ وہ بیویوں کو بھی تختہ مشق بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ بعض خواتین اپنی مجبوریوں کے باعث سر تسلیم خم کر لیتی ہیں جب کہ اکثریت اس پر طلاق کو ترجیح دیتی ہیں۔ ہمارے محلہ میں ایک خاتون بشریٰ نے محض اسی وجہ سے طلاق لے لی کہ وہ شوہر کی یہ خواہشات پوری کرنے سے قاصر تھی۔

ہمارے سکول کے ایک استاد کی شادی بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون سے ہوئی جو پائے کی ریاضی دان [illegible] اس نے موصوف استاد سے شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد طلاق [illegible] بارے میں بھی یہی سننے میں آیا کہ خاتون اپنے شوہر نامدار کی [illegible]ت کو پورا نہیں کر سکتی تھی' جو وہ اس کے ساتھ اپنی امت کی مسلمہ روایت کے طور پر ادا کرنا چاہتا تھا۔ جھوٹ وہ معاشرتی بیماری ہے جو کسی بھی معاشرے کی تمام اچھی اقدار کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ قادیانی نبوت کی بنیاد ہی جھوٹ ہے۔ لہٰذا یہ امت ہمہ وقت جھوٹ بولنا اپنا ایمان سمجھتی تھی۔ بڑے بڑے اکابرین اپنی کہی ہوئی باتوں سے یوں مکر جاتے ہیں جیسے وہ بات کہی گئی ہی نہیں تھی۔ ایک شخص چودھری نذیر خان ایک بار ہمارے گھر آیا اور کہنے لگا کہ "میرا بھائی اور بھابی مختار احمد ایاز اور

صالح بیگم جماعت کے مبلغ ہیں اور دونوں نے میرے حصے کی جائیداد ہتھیا کر اپنے نام کرا لی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ یہ جائیداد موروثی نہیں بلکہ ان کی اپنی خریدی ہوئی ہے"۔ اباجی نے اسے کہا "تم اس بارے میں کوئی ثبوت پیش کرو کہ جائیداد کے تم بھی وارث ہو" کہنے لگا ان لوگوں نے باپ کی بیماری کے زمانے میں ہر چیز اپنے نام کرا لی تھی۔ اب ثبوت تو میرے پاس ہے نہیں' بات قسم کی ہے مگر یہ لوگ جھوٹی قسم کھانے سے دریغ نہیں کرتے۔

ہماری گلی میں ایک حکیم صدیق آف میانی والے قیام پذیر تھے۔ ان کا بیٹا شریف صدیقی ایک بے روزگار نوجوان تھا۔ اس کو گھر میں کوئی وقعت حاصل تھی نہ گھر سے باہر اس کی کوئی عزت کرتا تھا۔ اس کا "ہینڈ رائٹنگ" بہت عمدہ تھا۔ وہ اباجی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے جب بھی سکول کے لئے چارٹ بنوانا ہوتا' اسے کہا جاتا۔ وہ بنا دیتا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے پوچھا "آپ کو نوکری کیوں نہیں ملتی؟" کہنے لگا "بھیا! میں نوکری حاصل کرنے کے قابل نہیں"۔ میں نے پوچھا آپ پڑھے لکھے ہیں پھر کیا وجہ ہے نوکری نہ ملنے کی"۔ کہنے لگا ربوہ میں نوکری حاصل کرنے کے لئے منافقت کی ڈگری ہونا ضروری ہے۔ زہر کو قند کہنے کا فن جسے آتا ہو' وہ شجر احمدیت کے اثمار سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ میری مجبوری ہے کہ میں احمدی ہو کر بھی اپنی آل نبوت اور امت کے ساتھیوں کی برائیوں اور خطاؤں سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ اپنے والدین' متعصب بھائیوں' محلے کے صدر اور جماعت کے اکابرین کے سامنے غلط کو غلط کہتا ہوں اور یہ چیز ان لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لہٰذا مجھ سے میرے گھر والے خوش ہیں نہ جماعت والے راضی۔ پھر مجھے نوکری خاک ملے گی؟"۔

ربوہ میں چڑے شکار کرنے کا رواج عام تھا۔ ہر گھر میں لوگ مرغیاں "تاڑنے" والے ٹوکرے کو ایک چھڑی کے سہارے اس طرح کھڑا کر دیتے کہ نیچے ایک خلا سا بن جاتا جہاں باجرہ بکھیر دیا جاتا تھا۔ جونہی چڑیا یا چڑا دانہ چگنے ٹوکرے کے نیچے جاتا' ٹوکرے کے ساتھ بندھی ہوئی رسی کھینچ لی جاتی۔ یوں بیچارہ چڑا مقید ہو جاتا

جس کو پکڑ کر ذبح کر لیا جاتا تھا۔ ربوہ والے کہتے تھے کہ وہ چڑے بھی اپنے "نبی" کی سنت کے طور پر کھاتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ مرزا غلام احمد چڑے پکڑتے اور انہیں سرکنڈے سے نہایت اذیت دہ طریقہ سے ذبح کیا کرتے تھے۔ ان کے امتی اس معاملہ میں قدرے رحم دل واقع ہوئے تھے جو سرکنڈے کے بجائے چاقو سے چڑے ذبح کرتے تھے۔ ہمارے سکول کے ایک ماسٹر مسعود جن کی شکل انتہائی ہیبت ناک تھی' چڑوں کے بڑے رسیا تھے۔ وہ لڑکوں کو چڑے پکڑ کر لانے کو کہتے تھے اور جو لڑکا انہیں چڑے فراہم کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتا' موصوف اسے نمبر دینے میں دریا دلی سے کام لیتے تھے۔ اس کے علاوہ ربوہ میں تلیر' شارک' لالی اور کبوتروں کا شکار بھی بہت کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ شکار کے لئے ایئرگن کے علاوہ غلیل بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی ہمیں بھی چڑوں کے شکار کا شوق ہوا۔ میں اور میرا کزن شکار کے ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے کہ ابا جی کو خبر ہو گئی۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ جو ہوا' اس کا نتیجہ بہرحال یہ تھا کہ پھر کبھی "چڑا کشی" کا خیال ہمارے ذہن میں نہیں آیا۔

ربوہ کے دکانداروں کا ناپ تول اس قدر بددیانتی پر مبنی تھا کہ خود اہل ربوہ اپنے ہم مذہبوں پر اعتبار نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ سودا سلف لینے کے لئے چنیوٹ یا لالیاں جانے کو ترجیح دیتے تھے یا چمن عباس کے نذیر چنگڑ سے اشیاء ضرورت خریدا کرتے تھے۔ شریف بٹ اور حفیظ سبزی فروش کے ساتھ اکثر لوگوں کا مول تول پر جھگڑا ہوا کرتا تھا اور تو اور یہ لوگ اپنی گندم پسوانے کے لئے ربوہ کی چکی پر جانے کی بجائے چمن عباس کے مسلمان چکی والے کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان تمام حقائق سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا گیا گزارا معاشرتی اور سماجی طور طریق مرزائیوں سے ہزار گنا زیادہ اچھا ہے۔ کہ یہ لوگ خود حقیقی زندگی میں مسلمانوں پر ہی انحصار کیا کرتے تھے۔

اس شہر کے باسیوں میں گالیاں دینے کا عام رواج تھا۔ وہ لوگ کشتی نوح میں مرزا غلام قادیانی کی مسلمانوں کو دی گئی گالیوں پر بڑے نازاں تھے اور ان کی تقلید میں

گالی دینا اپنا کمال سمجھتے تھے۔ ربوہ کا ایک ڈپو ہولڈر عبدالرحیم چیمہ مغلظات کا اس قدر ماسٹر اور خوگر تھا کہ اپنے ڈپو پر آنے والے گاہکوں کو بھی رگڑا لگا دیتا تھا۔ ایک بار کسی گاہک کو رحیم چیمہ گالی دے بیٹھا جس پر بات بڑھتی بڑھتی لمبی لڑائی کی شکل اختیار کر گئی۔ معاملہ امور عامہ سے ہوتا ہوا مرزا ناصر احمد کے پاس چلا گیا۔ مرزا ناصر احمد نے رحیم چیمہ کو طلب کر کے کہا "چیمہ صاحب! آپ کی شکایت آئی ہے کہ آپ اپنے ڈپو پر آنے والے گاہکوں کو گالیاں دیتے ہیں"۔

اس پر رحیم چیمہ نے کہا "جناب کہڑا بہن ------- کہندا اے"۔

یہ سن کر مرزا ناصر احمد اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ کہتے بھی کیا ان کی اپنی تعلیم بول رہی تھی۔

ربوہ میں بیاہ شادیوں کے سلسلے میں بھی عجیب فرق و امتیاز پر مبنی نظام رائج تھا۔ "اہل خاندان" ان کے حواریوں اور پوش علاقے کے باسیوں پر شان و شوکت سے شادی کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ ریلوے لائن کے ایک طرف لاری اڈہ والی سائیڈ پر محلہ دارالصدر کے باسی جو کریں' وہ سب اچھا تھا لیکن ریلوے لائن کے دوسری طرف کے مکین اور دارالرحمت محلوں والے مرکز کی ہدایات کے مطابق مسجد میں نکاح کیا کرتے تھے۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی تھی کہ متوسط طبقے کو شادی بیاہ کے اخراجات سے بچانے کے لئے یہ حکمت عملی اختیار کی گئی ہے جبکہ اہل زر و ثروت اپنے وسائل کی بنا پر سب کچھ کر گزرنے میں آزاد تھے۔

لو میرج بھی ربوہ کے کلچر کا حصہ تھی۔ اکثریت پسند کی شادی کرتی ہے۔ ہماری گلی میں ہی ایک لڑکی بشریٰ متین رہا کرتی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اس کی شادی طے کر رکھی تھی لیکن موصوفہ نے عین وقت پر شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی مرضی سے ایک مسلمان سے شادی رچا لی۔ اسے مرکز کی طرف سے ربوہ بدر کرنے اور سوشل بائیکاٹ کی دھمکی بھی دی گئی مگر اس نے کسی کو خاطر میں لانے سے انکار کر دیا۔ ہمارے ایک کلاس فیلو ظہیرالدین بابر نے والدین کی طرف سے پسند کی شادی میں

رکلوٹ پر خودکشی کی کوشش کی۔ میوہسپتال کی ایک نرس ناصرہ نے بھی پسند کی شادی کرلی۔ اور گھروالوں کو اس وقت بتایا جب وہ ماں بننے والی تھی۔ "لو میرج" یوں تو ہر معاشرے میں ہوتی ہے لیکن ربوہ کلچر میں اس کی نوعیت مختلف تھی۔ خاندان نبوت کے بڑے بوڑھے اور نوجوان تو جماعت کی کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے میں آزاد تھے۔ لیکن جماعت کے عام افراد پر پابندی تھی۔ گو وہ بھی اس پابندی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثریت اپنے والدین یا گھروالوں کو خبر کیے بغیر بھی شادیاں رچالیا کرتی تھی۔

مرزا ناصر کے بھائی مرزا رفیق نے چنیوٹ کے ایک سابق ہیڈ ماسٹر جلیل شاہ کی بیٹی کو کسی طرح شیشے میں اتارا اور اس کے والدین کی رضامندی کے بغیر شادی کرلی۔ بعد ازاں جلیل شاہ کو دلفریب مالی آسودگی کی پیشکش کی گئی۔ جس پر موصوف نے مذہب اور عزت کو عیش و عشرت پر وار دیا اور اپنے پورے خاندان کے ساتھ ربوہ آگیا۔ اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد ربوہ میں ٹیوشن سنٹر کھول لیا۔ وہ بزعم داماد تعلیمی بورڈ کے ہم مذہب و ہم مشرب ارباب حل و عقد سے انگریزی کے گیس حاصل کر کے طلباء کو منتخب سوالات کروا اور بتا دیتا۔ امتحان میں وہی سوالات آ جاتے جس سے طلباء امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کر لیتے۔ اس طریق کار سے جلیل شاہ کے گھر ٹیوشن پڑھنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی لیکن سیاہ فام جلیل شاہ کا خاصا تھا کہ وہ لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھانے کو ترجیح دیا کرتا تھا۔ سارے دن میں لڑکیوں کی کئی کلاسیں لیتا جبکہ لڑکوں کی صرف ایک کلاس ہوا کرتی تھی۔

ربوہ کی ایک خاتون ٹیچر ایک سرکاری افسر کے دام محبت میں آگئی موصوف پہلے ہی شادی شدہ اور ایک بیٹے کا باپ تھا۔ اس ٹیچر کو اس نے دوسری شادی کی پیشکش کی تو اس نے شرط رکھ دی کہ پہلی بیوی کو طلاق دو پھر شادی کروں گی۔ کافی ردوکد کے بعد یہ شادی تو ہو گئی لیکن سرکاری افسر نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی اور بیٹے کو ننھیال کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ طلاق دلوا کر شادی رچانے کا رواج بھی ربوہ

کی عورتوں میں عام تھا۔ جبکہ اکثر مرد بھی دوسروں کی بیویوں کو شیشے میں اتار کر طلاق پر راغب کر لیتے اور بعد میں شادی رچا لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا۔ ربوہ میں طلاق کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کا اعجاز تھا کہ عائلی زندگی عدم استحکام کا شکار رہتی تھی۔

ربوہ میں قومی سطح پر باسکٹ بال کھیلنے کا بہت رواج تھا۔ سکول و کالج کی طرف سے ہر سال آل پاکستان ناصر باسکٹ بال ٹورنامنٹ کروایا جاتا تھا۔ جس میں ملک بھر کی مختلف ٹیمیں شرکت کرتی تھیں۔ ریلوے کی ٹیم کو بہت پذیرائی حاصل ہوتی تھی۔ اس ٹیم کے کپتان جاوید الحسن کو اہل ربوہ بہت پسند کرتے تھے۔ ربوہ کے اکثر نوجوان جاوید الحسن بن کر باسکٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ اکثر لڑکے کہا کرتے تھے کہ جاوید الحسن مرزا ناصر احمد کی خصوصی مہربانیوں سے متاثر ہو کر مرزائی ہو چکا ہے۔ لیکن اصل حقیقت اللہ پاک جانتے ہیں۔ باسکٹ بال کے علاوہ ربوہ میں کرکٹ بھی کھیلی جاتی تھی۔ سکول کے زمانے میں ہمارے سکول کا چنیوٹ کے اصلاح ہائی سکول کے ساتھ اکثر میچ ہوا کرتا تھا جو چنیوٹ کی کمال گراؤنڈ میں کھیلا جاتا تھا۔ ہم سب لڑکے ریل گاڑی پر چنیوٹ جاتے اور میچ دیکھتے تھے۔ شہر میں عام طور پر لڑکے "میرو ڈبہ" "پٹھو گرم" اور "باندر کلا" کھیلا کرتے تھے۔ جبکہ لڑکیاں "شاپو" کھیلتی تھیں۔

ہر محلہ میں اکثر و بیشتر جماعت کے کئی اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ مرزائی مرکز کی طرف سے کوئی بھی ہدایت جاری ہونے کے بعد محلہ کے تمام افراد کو مساجد میں طلب کر لیا جاتا تھا۔ اس کے لئے "میگا فون یعنی بھونپو" پر لوگوں کو بلایا جاتا تھا۔ شہر میں عموماً ان الفاظ میں اعلان ہوتا تھا "حضرات! اعلان کیا جاتا ہے کہ محلہ دارالرحمت غربی کے تمام مکینوں کا ایک اجلاس محلے کی مسجد میں صدر محلہ کی زیر صدارت بعد از نماز عصر ہو رہا ہے۔ تمام اہل محلہ اس میں اپنی شرکت کو ضروری بنائیں"۔

نماز کے اوقات میں شہر بھر کی دکانیں بند کر دی جاتی تھیں۔ دکاندار نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، دکان بہرحال بند رہتی تھی۔ ایک دکاندار جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا

ہے' دارالخیر جنرل سٹور کا مالک امین گاہکوں سمیت دکان کے اندر رہتا اور دکان کا شٹر گرا لیا کرتا تھا۔ چنانچہ جتنی دیر نماز ہوتی رہتی تھی' گاہکوں کو بھی دکان میں بند رہنا پڑتا تھا۔

شہر بھر میں دیواروں پر فضول قسم کی باتیں لکھنے کا بھی بہت رواج تھا۔ خوبصورت لڑکے کو وہاں کے لوگ اپنی کسی مخصوص اصطلاح میں "کے ٹو" کہا کرتے تھے۔ ہمارا ایک دوست عبدالسمیع سہیل جو سرگودھا سے آیا تھا' اس کے حسن کے بہت چرچے تھے۔ ہر دیوار پر جلی حروف میں لکھا ہوتا تھا "ربوہ کا مشہور و معروف تحفہ سہیل کے ٹو" اہل شہر کو "کے ٹو" سے کیا نسبت تھی' اس کا مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا۔ تاہم کئی دیواروں پر یہ الفاظ بھی تحریر ہوتے تھے کہ "بے وفا دوست سے کے ٹو سگریٹ اچھے ہوتے ہیں"۔

لوگوں کو گھر سے بلانے کے لئے عجیب طریق کار مروج تھا۔ جب کوئی شخص کسی کے گھر جاتا تو دروازہ "ناک" نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ ہر گھر پر "کال بیل" بھی لگی ہوتی تھی۔ جانے والا دروازے کے باہر کھڑا ہو کر زور سے "السلام علیکم" کہتا جس کے جواب میں صاحب خانہ باہر آ جاتا تھا۔ مرزائی اس طریقہ کار کو مذہبی لحاظ سے انتہائی شائستہ عمل قرار دیتے تھے۔ دوسری طرف عالم یہ تھا کہ اگر کوئی شخص گھر سے باہر نہ آتا یا دروازہ نہ کھولتا تو آنے والا کسی بچے کی خدمات حاصل کرتا۔ بچہ دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوتا اور صاحب خانہ کو باہر آنے کے لئے کہتا۔ نتیجتہً اسے باہر نکلنا ہی پڑتا۔

ان واقعات و حقائق سے یہ اندازہ لگانا نہایت آسان ہے کہ ربوہ کی معاشرتی زندگی کس قدر تضادات کا مجموعہ تھی جس کی بنا پر مرزائی امت کی منافقت کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

احمقوں کی جنت

ربوہ سے کوٹ امیر شاہ جانے والے راستے پر پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع و عرض چار دیواری ہے جس میں قبروں کا لاتناہی سلسلہ ہونے کے باوجود بہت سی زمین ابھی مزید قبروں کے لئے باقی ہے۔ یہ قبرستان مرزائیوں کی جنت ہے۔ اس چار دیواری کے پیٹ میں آنے والے مرزائی اپنی امت کے "نام نہاد جنتی" کہلاتے ہیں۔ اس قبرستان سے ملحقہ چار دیواری کے باہر سبزہ اور سایہ دار درختوں سے محروم گورستان ان لوگوں کا ہے ' جنہیں "مرزائی بادشاہ" کی جنت حاصل نہیں ہوئی یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ وہ "جنت" حاصل نہیں کر سکے۔ دراصل ان لوگوں کو غالب کے بقول "اس جنت" کی حقیقت کا پتہ تھا چنانچہ انہوں نے محض دل کو خوش رکھنے کے لئے "ایسی جنت" کے حصول کے لئے ہیر اور پر نہیں مارے۔

مرزائی امت کے "جنتیوں" کے اس مقبرے کو بہشتی مقبرہ کہتے ہیں جو مدینہ کے "جنت البقیع" کا مماثل تیار کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اور یہ بھی اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ قادیانی امت اسلامی اصطلاحات اور شعائر اسلامی کی ایک نہایت بھونڈی نقل کر رہی ہے۔

مرزا غلام احمد کی نبوت باطلہ کی طرف بلانے والے پراپیگنڈے کے زور سے لوگوں کو اپنے دام فریب میں لاتے وقت ایسے طریقے سے ان کی "برین واشنگ" کر دیتے ہیں کہ ان کی حیثیت ایک روبوٹ کی سی ہو جاتی ہے۔ جنہیں وہ عمر بھر اپنے اشاروں پر نچاتے رہتے ہیں مگر ان کا احساس زیاں کبھی بیدار نہیں ہونے دیتے۔ "مرزا غلام احمد" نے اپنے زمانے میں تبلیغ کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ کسی بھی شخص کو بیعت کرتے وقت اس سے عہد لیا جاتا کہ وہ اپنے سگے اور خونی رشتہ داروں سمیت تمام "مسلمانوں" سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں رکھے گا جب تک وہ احمدی نہیں ہو

جاتے۔ حتی کہ ان کے جنازوں میں بھی شریک نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ اپنی آمدن کو بھی اپنی مرضی کی طرح "احمدیت" کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کے مال اور مزاج پر زندگی بھر اس نام نہاد نبوت کے ٹھیکداروں کا قبضہ رہے گا۔

مرزا غلام احمد کے خاندان نے اپنی اس "غنڈہ گردی" کو عملاً" قائم رکھنے کے لئے امت پر بے شمار اقسام کے "چندے" یعنی **جگا** ٹیکس عائد کر رکھے ہیں۔ جن سے احمدی امت کے کسی فرد کو فرار حاصل نہیں۔ انہی چندوں میں ایک "وصیت" کا چندہ' جو در حقیقت "مرزائی جنت" میں داخلے کا ٹکٹ ہے۔

"بہشتی مقبرے" میں تمام قبریں ایک حاشیے میں ترتیب سے بنائی گئی ہیں جن پر باقاعدہ نمبر لگائے جاتے ہیں۔ قبروں کی شکل اس طرح ہے کہ ہر قبر کے کنارے پختہ اینٹوں سے بنائے گئے ہیں جبکہ اوپر سے قبر کچی رہتی ہے۔ تاہم اس کا کتبہ اچھا اور خوبصورت بنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ڈیزائن کا خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی کتبہ دوسری قبروں کے کتبے سے مختلف نہیں۔ قبرستان میں ایک اور چھوٹی سی بے چھت چار دیواری ہے جس میں داخلے کے لئے ایک دروازہ لگا ہوا ہے جس کے اندر مرزا محمود احمد اور مرزا ناصر احمد سمیت مرزائی خاندان نبوت کے خاص خاص "گرگوں" کی قبریں ہیں جنہیں یہاں اماناً" دفن کیا گیا اور جونہی ان لوگوں کو ربوہ سے قادیان جانے کی اجازت ملے گی' وہ "دھرتی کے اس بوجھ" کو یہاں سے اٹھا کر بھارت لے جائیں گے۔ یہاں یہ لکھنا بے جا نہیں ہوگا کہ اب جبکہ مرزائی خلیفہ مرزا طاہر جو کہ "راجہ داہر" بن کر مرزائی امت پر حکمرانی کر رہے ہیں لندن سے بے شمار دفعہ بھارت جاتے اور قادیان کے چکر لگاتے ہیں انہیں اپنے باپ' بھائی سمیت دیگر لوگوں کی میتوں کو قادیان پہنچا دینا چاہیئے تاکہ پاکستان کی سرزمین ان لوگوں کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔

وصیت کرنے والوں کو ایک معقول رقم اپنی منقولہ غیر منقولہ جائیداد کے ۱/۴ کے برابر دے کر جنت کی ٹکٹ اور بہشتی مقبرہ کی قبر حاصل کرنا پڑتی ہے۔ ایسے لوگوں پر یہ پابندی ہے کہ یا تو وہ ساری رقم یک مشت ادا کر دیں یا پھر اقساط کی شکل میں

دیتے رہیں اور اگر اس دوران ان کا انتقال ہو جائے تو یہ رقم وہ شخص ادا کرے جس کو مرنے والا اپنی زندگی میں نامزد کرتا ہے۔

"بہشتی مقبرہ" یعنی مرزائیوں کی جنت میں داخلے کی ٹکٹ کے بارے میں جب مقامی لوگوں سے دریافت کیا تو کسی ایک نے بچ بچا کر وضاحت کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ "خاندان نبوت" کے کل پرزوں نے اپنی امت کو چاروں طرف سے لوٹنے کے لئے مختلف بہانے بنا رکھے ہیں۔ جنت کی ٹکٹ کی قیمت دراصل بہشتی مقبرے میں قبر کی زمین کی قیمت ہے جس کو جنت کی کنجی قرار دے کر اس کی بھاری قیمت لگا دی گئی۔ عقل مارے مرزائی بے شمار گناہ کرنے کے باوجود دولت کے زور پر جنت میں جانے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اسے مرزائیوں کی جنت کے بجائے احمقوں کی جنت کہا جائے تو بے جا نہیں ہو گا۔ وہ اس لئے کہ کوئی بھی شخص زندگی میں اپنی قبر کھود کر نہیں بیٹھتا۔ یہ درست ہے کہ کسی کو اپنی موت کی خبر نہیں' کوئی دم بھی دم آخر ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ایک امید کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے لوگ موت کے بارے میں لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں سوچتے اور برسوں جیئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ربوہ کی نبوت باطلہ کے پرچارکوں نے امت کی جیبیں خالی کرانے کے لئے انہیں زندگی میں اپنی قبریں بنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہشتی مقبرے میں قبر حاصل کرنے کا خواہشمند جب چندہ وصیت ادا کر دیتا ہے یا اس کی اقساط کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو اسے موصی نمبر اور وصیت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کے مرنے کے بعد نام نہاد بہشتی مقبرہ میں اس کی قبر کی جگہ مخصوص ہو سکے۔ ایسے شخص کو مرزائی امت بہت خوش نصیب کہتی ہے۔

میاں عطاء الرحمٰن کے بیٹے لطف الرحمٰن محمود جن کا ذکر اس سے قبل بھی کیا گیا ہے' انہوں نے وصیت کی اور اپنی دولت اندھے کنوئیں میں پھینکنی شروع کر دی تو ان کے گھر عزیزوں رشتے داروں کا میلہ لگ گیا۔ ہر کوئی مبارک باد کے ڈونگرے برسا رہا تھا اور ان کے نصیب پر نازاں ہو رہا تھا۔ یہ منظر میں نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

جسے دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ "کیا نادانی سی نادانی ہے"۔

عام معاشرے میں جس طرح ٹیکس گزار کسی بھی جگہ اپنی حیثیت جتانے اور برتری منوانے کے لئے کہتے ہیں میں "ٹیکس گزار" ہوں اسی طرح ربوہ میں بھی جن لوگوں نے وصیت کی ہوتی اور جنت کا ٹوکن ان کی جیب میں ہوتا وہ ہر موقع پر اپنی حیثیت کا تذکرہ لے بیٹھتے اور کہتے "میں موصی ہوں" گویا یہ بات ان لوگوں کا "سٹیٹس سمبل" بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ مرزائیت کے لئے زندگی وقف کرنے والوں کی اکثریت نے اپنے گھر کے دروازے پر آویزاں نیم پلیٹ پر بھی یہ واقف زندگی کی "ڈگری" تحریر کر رکھی ہوتی تھی۔ یعنی منیر احمد سالک "واقف زندگی"۔ علاوہ ازیں جنت کے ان مسافروں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ پر بھی اپنا "حیثیتی نشان" رقم کر رکھا ہوتا تھا یعنی عطا المجید واقف زندگی۔ ایک دلچسپ بات جو بیان کرنا ناگزیر ہے وہ یہ کہ جن لوگوں نے زندگی وقف نہیں کرائی ہوئی ہوتی تھی' ان کو یہ واقف زندگی اور جنت کی ٹکٹوں سے سخت چڑ تھی۔ ایک بار غلہ منڈی کے بازار میں دو بوڑھوں کی لڑائی ہو گئی۔ دونوں نے خود کو ایک دوسرے سے برتر ثابت کرنے کے لئے کئی دلائل دینے کے علاوہ خاصی بھاری بھرکم مغلظات سے بھی کام لیا لیکن ایک دوسرے کو چت نہ کر سکے۔ آخرکار ایک بوڑھے نے دور کی کوڑی لا کر کہا "تم نہیں جانتے میں واقف زندگی ہوں واقف زندگی تیری میری کیا برابری"۔ اس پر پہلے بوڑھے نے نہایت مدلل جواب دیا جو اس کے حریف پر ہی نہیں' مرزائیت کے منہ پر بھی ایک طمانچہ ہے۔ کہنے لگا "جا اوئے مورکھا! زندگی وچ ای اپنی قبر بنا لئی ای تے کہندا ایں میں واقف زندگی آں۔ اس جنت دا کی فائدہ جہڑی ہزاراں روپے دے کے لینی اے"۔ اس پر دونوں اطراف سے سیز فائر ہو گیا۔ کئی دکاندار اور راہ گیر جو اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے' انہوں نے بھی موخرالذکر بابے کے "کومنٹس" پر کہا "بھئی بابا جی کہندے تے سچ نے"۔

مولوی احمد خان نسیم کے بارے میں پہلے بھی تحریر کیا گیا ہے یہ ایسا مبلغ تھا جو دیہاتیوں کو گھیر گھار کر مرزائیت میں لاتا اور ان کے مال و دولت سے اپنے جھوٹے نبی

کے خزانے بھرتا تھا۔ اس نے ایک شخص فیض محمد کو مرزائی کر لیا۔ یہ ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ عقیدت کے چکر میں اس نے ربوہ میں اپنا گھر بنایا اور بال بچے سمیت یہاں منتقل ہو گیا۔ اور اپنے قبیلہ برادری سے قطع تعلق کر لیا۔ اس نے بھی ربوہ والوں کو ہر قسم کا چندہ دینے کے علاوہ وصیت کر ڈالی۔ دولت کی فراوانی تھی تو چندے دینا کوئی مہنگا نہیں تھا۔ لیکن اچانک فیض محمد کو فصلوں سے آنے والی آمدن کم ہونے لگی۔ ان کے بھائیوں نے بھی زمین کے مقدمے جیت کر اسے اس کے حصے کی زمین سے محروم کر دیا۔ ربوہ میں اس کا ڈیپارٹمنٹل سٹور بھی خسارے میں چلا گیا۔ اس کو دال روٹی اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لالے پڑ گئے۔ لیکن چندوں کے ناگ منہ کھولے اسے نگلنے کے لئے ہر گھڑی تیار رہتے تھے۔ جب بھی چندہ لینے والے "ملاں عرف مربی" آتے تو کہتے "مہرجی اوکھے سوکھے ہو کے چندہ دیندے رہو' اللہ خیراں کر دے گا"۔ حالات کے ستائے ہوئے فیض محمد نے ایک روز چندہ لینے والے "ملاں" کو گریبان سے پکڑا اور مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ "مرزا غلام احمد" اور اس کی آل کے علاوہ مولوی احمد خان نسیم کی تمام خواتین خانہ کے ساتھ اپنے تمام تر تعلق جوڑتا ہوا کہہ رہا تھا "ایسی جنت کو سات سلام جو پیسوں سے ملے۔ میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں اور ان ظالموں کو چندے کی پڑی ہے"۔ بہت سے بڑے بوڑھے مرزائیوں نے اسے سمجھانے اور استغفار کرنے کی تلقین کی کوشش کی مگر اس کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر انہیں "چندے والے ملاں" کا انجام یاد آ گیا جو فضل عمر ہسپتال کے "مفلس وارڈ" میں بے یار و مددگار پڑا تھا۔

کہتے ہیں "قبرستان جا کر انسان کو موت یاد آتی ہے اور وہ زندگی کے سبق سیکھتا ہے۔ ربوہ کے ایک مکین خورشید احمد چیمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے موصوف واقف زندگی تھے۔ اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ کاٹ کر مرزائی خاندان نبوت کا دوزخ بھرتے تھے۔ مرزائیوں کے بہشت میں ان کی قبر کا رجسٹرڈ نمبر بھی لگا دیا گیا تھا۔ ایک روز وہ اپنی قبر دیکھنے بہشتی مقبرے گئے تو قدرت کو ان کی سادگی پر پیار آ گیا اور جس نے

انہیں ہدایت دینے کا وسیلہ بنا دیا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ انہوں نے دیکھا کہ ان کی قبر میں کتا پیشاب کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں اس قدر نفرت ہوئی کہ انہوں نے ایسی جنت کا خیال دل سے نکال دیا اور چندوں کی رقوم عزیز و اقارب اور مرزائی نبوت اور اس کے خانوادوں پر تین حرف بھیج کر مسلمان ہو گئے۔

حوریں

ہم نے سن رکھا تھا کہ ربوہ میں جنت اور حوریں بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ کیسے جانا جائے کہ جنت دوزخ کہاں ہیں اور حوریں کدھر اور کیسی ہوتی ہیں۔ ابا جی سے جو معلومات ملیں' ان سے جنت دوزخ کے بارے میں تو کچھ پتہ چل گیا مگر حوروں والا قصہ ابھی تک تشنہ بلکہ نامکمل تھا۔ کسی مرزائی لڑکے سے اس بارے میں دریافت کرنا بھی مشکل تھا۔ ہماری کلاس میں ایک لڑکا عبدالمالک پڑھتا تھا۔ دیہاتی لب و لہجے کا یہ لڑکا مرزائیوں کے سخت خلاف تھا۔ مگر اپنے باپ کی جائیداد سے محرومی کے خوف سے مرزائیت کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ ایک دن وہ مرزائیت اور اس کے ماننے والوں کے شجرہ نسب پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اس سے حوروں کے متعلق پوچھ ڈالا۔ غصے میں وہ پہلے ہی تھا۔ میرے استفسار پر اس نے حور و قصور کی پوری تفسیر بیان کر ڈالی۔ کہنے لگا:

> "سوہنیا! حوراں کلوھیاں نے' ربوے دیاں ساریاں کڑیاں نوں ای حوراں کہندے نے' تاہم کچھ حوریں اصلی ہوتی ہیں بعض نعلی"۔
>
> پوچھا "نعلی اور اصلی حوروں سے مراد" جواب ملا "یار! اصلی حوراں مرجو آنیاں دیاں زنانیاں نے تے نعلی حوراں حماتڑاں دیاں رناں نے"۔

مالک سے میں نے سوال کیا ان لوگوں کی خواتین اصلی اور تم والی نعلی حوریں کیوں' اس پر وہ مسکرایا اور کہنے لگا "بھائی اوہ اصلی دیسی گھی دیاں نے نا" وہ اس طرح کہ ہمارا نبی خواہ سچا ہے یا جھوٹا' اس سے قطع نظر نبی تو ہے نا۔ اب اس کی آل اولاد میں جتنی لڑکیاں ہیں' وہ خوبصورت بھی ہیں' امیر بھی۔ ان کے لباس' شکل و صورت

اور نشست و برخاست ہماری عورتوں سے مختلف اور پر کشش ہے۔ چنانچہ انہیں اصلی حوریں ہی کہا جائے گا جبکہ ہماری عورتیں مرتبے' مقام اور جیب کے اعتبار سے ان جیسی تو نہیں ہیں لیکن اس نبی کی امت تو ہیں' جسے ہم نے مان لیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے حوروں والی صفات ہماری خواتین کے حصے میں بھی آتی ہیں"۔

اتنی معلومات ملنے کے بعد میں نے حوروں کے بارے میں خود بھی مشاہدہ کیا تو مجھے ربوہ کی ہر عورت حور ہی لگنے لگی۔ کیونکہ مرزائی عورتوں کا اپنی طرف متوجہ کرنے کا جو انداز ہے' اس سے وہ خواہ مخواہ ہی حوریں لگتی تھیں۔ سیاہ رنگ کے ان کے برقع کی وضع قطع کچھ اس طرح کی ہوتی کہ ہر خاتون "سیکس اپیلڈ" نظر آتی تھی۔ برقع کا نچلا حصہ لمبا اور چغہ نما ہوتا جو کہنے کو برقع مگر اس میں ملبوس ہر خاتون ایک فتنہ خوابیدہ نظر آتی تھی۔ سر پر تکونی سکارف اور اس کے ساتھ دو نقاب اپنے اندر ایک طوفان چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر عورت ایک نقاب سے چہرے کا نچلا حصہ ناک تک چھپا لیتی ہے جبکہ دوسرا نقاب سر پر لپیٹ لیا جاتا ہے۔ صرف آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں جو آنکھوں آنکھوں میں باتیں کر جاتی ہیں۔ بعض مہ جبیں شہر آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا کر اچھی بھلی دشمن عقل و ایمان بن جاتی ہیں۔ اس گٹ اپ میں معمولی سی شکل و صورت والی عورتیں بھی ماہ لقا اور حور شمائل نظر آنے لگتی ہیں۔

مرزائی خاندان نبوت کی خواتین واقعی حسن و جمال کا پرتو ہیں "عزازیلی" حسن کی بناپر ہی یہ جھوٹا مذہب چل رہا ہے۔ حسینانان ربوہ کو حوریں کہنا اگرچہ شاعری کے زمرے میں آتا ہے لیکن جس کسی نے شاعرانہ ترنگ میں مرزائی خواتین کو حوریں کہا ہے' اس میں اس کی خرد قصور وار نہیں۔ یہ دست قدرت کا کمال ہے یا کالے برقع کی فسوں سازی جس نے وہاں کی ہر عورت کو حور بنا کر رکھ دیا ہے۔

مرزائی امت کے ارباب اقتدار اور شہر کے عوام الناس نے اپنے ہر قول و عمل پر منافقت کا لبادہ چڑھا رکھا ہے۔ ربوہ کے معاشرے کو پاکیزہ اور مثالی ظاہر کرنے کے لئے مختلف ڈرامے بازیاں کی جاتیں۔ جن میں شہر کے ایک کونے پر جامعہ نصرت

گرلز کالج اور نصرت گرلز ہائی سکول اور دوسرے کونے پر لڑکوں کے تعلیم الاسلام ہائی سکول اور ٹی آئی کالج کی تعمیر قابل ذکر ہے۔ اس تعمیر کی غایت بظاہر یہ تھی کہ باہر کی دنیا پر یہ ثابت کیا جائے کہ صنف نازک اور صنف کرخت کے تعلیمی اداروں میں انتہائی فاصلے ایک مثالی معاشرے کی شاندار مثال ہیں۔ لیکن ان کی منافقت اور ڈرامے بازی اس وقت انتہائی مضحکہ خیز ثابت ہوتی جب دریائے چناب' الف محلّہ' دار نصر' دارالبرکات اور پہاڑی کے دامن میں واقع دارالیمن کی لڑکیاں اپنے سکول کالج کے لئے ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتی ہوئی آ رہی ہوتی جبکہ فیکٹری ایریا' محلّہ دارالصدر' محلّہ دارالرحمت غربی' شرقی' وسطی' ریلوے سٹیشن کے علاقے کے لڑکے دریا کی طرف اپنے سکول و کالج جا رہے ہوتے تھے تو دونوں اصناف کا آپس میں کراس ہوتا۔ اس دوران بے شمار لڑکے لڑکیوں کے آپس میں مسکراہٹوں اور رقعوں کے تبادلے ہو جاتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔

ایک مرتبہ میں اور میرا کزن محمد شفیع ریلوے لائن میں چلتے ہوئے سکول جا رہے تھے۔ راستے میں ایک شیریں کو اپنے فرہاد کی نگاہوں سے بلائیں لیتے دیکھا تو لامحالہ ہمارا دھیان ادھر چلا گیا۔ اس محویت میں پیچھے سے آتے ہوئے ریلوے انجن کی آواز بھی نہ سنائی دی۔ قدرت کو ہماری زندگی مقصود تھی کہ انجن ابھی چند گز کے فاصلے پر تھا کہ ہم نے دائیں بائیں جانب چھلانگیں لگا کر جان بچالی ورنہ ایک حور کے کمالات کا نظارہ ہمیں دوسری دنیا پہنچا چکا ہوتا۔

ربوہ کی ایک لڑکی کا نام نجمہ تھا جسے سب لوگ نجمی کہتے تھے۔ اس کی چنیوٹ کے ایک مسلمان لڑکے ظہیر احمد سے نہ جانے کیسے ملاقات ہو گئی اور اسے اپنا دیوانہ بنا لیا۔ یہ لڑکا یتیم تھا اور تعلیم حاصل کرنے ملتان سے اپنی بہن کے پاس چنیوٹ آیا ہوا تھا۔ ظہیر کے گھر والوں نے سنا ہوا تھا کہ ربوہ میں تعلیم بہت اچھی ہے۔ لہٰذا اسے فرسٹ ایئر میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کی نجمی سے ملاقات ہوئی تو وہ ظہیر پر لٹو ہو گئی۔ دسمبر ٹیسٹ میں جب ظہیر میاں فیل ہو گئے تو اس کے گھر والوں

کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے اپنے طور پر انکوائری کی تو معلوم ہوا کہ میاں صاحبزادے تو ایک حور کی زلفوں کے اسیر ہو چکے ہیں۔ بس پھر کیا تھا' پہلے تو ان کی خوب دھنائی ہوئی مگر جب عشق کا بھوت ان کے سر سے اتارے نہ اترا تو موصوف کو گھر والوں نے واپس ملتان بھیج دیا۔

حوروں کے سب سے بڑے "دو ڈپو" مرزا محمود احمد کی بیویوں مہر آپا اور مریم صدیقہ المعروف چھوٹی آپا کے گھروں میں تھے "رحم سے خالی" مہر آپا کے پاس جماعت کی دیوداسیوں کی ایک فوج تھی جو بظاہر اس کی خدمت پر مامور تھی مگر درحقیقت وہ اپنے نبوت زادوں کی دلبستگی کا سامان کرتیں یا احمدیت کے دام میں آنے والے نئے پنچھیوں کے پاؤں میں اپنی زلفوں کی بیڑیاں ڈالا کرتی تھیں۔

ربوہ کے تمام مرد دو مقامات پر سر نگاہ جھکا اور ہاتھ باندھ لیا کرتے تھے۔ ایک جب وہ اپنے خلیفہ' اس کی اولاد یا جھوٹے خاندان نبوت کے کسی بھی فرد کے سامنے پیش ہوتے' دوسرے اس وقت جب حوریں ان کے سامنے آتیں۔ "ربوی مرد" کنکھیوں سے انہیں دیکھ تو لیتے مگر ان سے نظر ملانا نہ جانے کیوں ان کے بس میں نہیں ہوتا تھا۔ کئی ایک سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اپنے "نبی" کی نام نہاد تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "ہم اپنی مذہبی تربیت کی بنا پر عورتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے جبکہ عورتیں ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھ لیتی ہیں"۔

جامعہ نصرت کالج فار ویمن کی پرنسپل فرخندہ شاہ جو مسز شاہ کے نام سے مشہور تھیں ان کی مرزائیت کے لئے "خدمات" کو بہت سراہا جاتا تھا۔ ان کی علمیت کے علاوہ زبردست ڈسپلن کے قصیدے بھی قصر خلافت میں چار دانگ پڑھے جاتے تھے۔ ان کے بیٹے نے اپنی والدہ کو کالج میں سوشل ورک کا مضمون تعارف کرانے کا مشورہ دیا جسے قبول کر لیا گیا اور پھر بیٹے ہی کی سفارش پر ایک مسلمان لڑکی مس نجف کو سوشل ورک کی لیکچرار کے طور پر ملازمت دے دی گئی۔ اس مسلمان لیکچرار نے مسز شاہ کے سخت نظم و ضبط اور قصر خلافت میں نیک نامی پر پانی پھیر دیا۔ اور پرنسپل کے بیٹے کو پہلے

مسلمان کیا۔ بعد میں اس کے ساتھ شادی رچا کر اسے کفرستان سے لے کر نکل گئی۔ قصر خلافت مسز شاہ اور حوریں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ حوروں کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات جسے ہر شخص انجوائے کیا کرتا تھا کہ جامعہ نصرت گرلز کالج کی پرنسپل مسز شاہ' نصرت گرلز ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس مسز بشیر اور فضل عمر فاؤنڈیشن انگلش میڈیم سکول کی پرنسپل تینوں بیوہ تھیں۔ اکثر لوگ از راہ مذاق کہا کرتے تھے کہ تینوں "میڈموں" نے نہ جانے کیوں اپنے شوہروں کو دنیا سے باجماعت رخصت کر دیا ہے اور مرزائی مرکز نے زنانہ تعلیمی اداروں کے لئے تین بیوائیں ہی کیوں منتخب کیں۔

ہمارے چنیوٹ کے ایک دوست کی بہن جو نصرت گرلز ہائی سکول کی طالبہ تھی اس کے گھر والوں نے چنیوٹ سے لاہور منتقل ہونا تھا چنانچہ اس نے آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد نویں کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا چاہا مگر سکول کی ہیڈ مسٹرس مسز بشیر نے سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا اور کہا "بچی لائق ہے اسے ہم میٹرک پاس کرنے تک سکول سے نہیں فارغ کریں گے"۔ سکول کے مینجر چودھری علی اکبر ہمارے دوست مقصود الرحمٰن کے والد تھے ان کی سفارش کرائی مگر بے سود۔ آخر ہمارے ایک اور کلاس فیلو عبدالحیٔ طاہر دور کی کوڑی لائے انہوں نے یونائیٹڈ بنک کے مینجر لطیف اکمل سے بات کی جنہوں نے ایک فون کیا اور اگلے ہی لمحے مسز بشر نے سرٹیفکیٹ دینے کی حامی بھر لی۔ ہمارا کام تو ہو گیا مگر لطیف اکمل سے اس ان ہونی کے ہو جانے کے اسباب پوچھے تو انہوں نے آنکھ دبا کر کہا "بھائی یاری کی کچھ تو پردہ داری ہونی چاہئے"

ایک مرتبہ ہمارے ایک جاننے والوں کی نصرت گرلز ہائی سکول کی طالبہ بیٹی نویں جماعت میں فیل ہو گئی۔ لڑکی کے والد نے سکول انتظامیہ سے ملنے کے بعد لڑکی کے پرچے دوبارہ چیک کر کے اسے رعایتی نمبر دلوا کر پاس کرانے کی درخواست کی۔ اس سلسلے میں اس کی ملاقات لڑکی کی کلاس ٹیچر سے ہوئی جس نے لڑکی کے باپ کو بتایا کہ لڑکی کی نالائقی کی وجہ اس کا چال چلن ہے۔ یہ اور اس کی سہیلیوں کا گروپ کلاس سے اکثر غائب رہتا ہے اور یہ سب ایک دوسرے کے بوائے فرینڈز کو محبت نامے

پہنچانے اور ملاقاتیں ارینج کرانے میں مصروف رہتی ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پڑھائی میں کمزور رہ گئی ہے۔ لڑکی کا والد جو پہلے ہی بیٹی کی ناکامی پر سر پیٹ رہا تھا' اب بچی کے مشکوک چال چلن کی خبر پر سخت پریشان ہو گیا۔ جب لڑکی اور اس کی سہیلیوں سے معلوم کیا گیا تو انہوں نے ایک اور ہی کہانی سنا ڈالی کہ موصوف ٹیچر کے خود کچھ مشکوک لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں اور وہ اپنی "خوب رو" طالبات کو ان لوگوں سے ملاقات پر مجبور کرتی ہے۔ اور جو لڑکیاں بات نہیں مانتی ' انہیں نہ صرف کلاس میں زچ کیا جاتا ہے بلکہ امتحان میں بھی فیل کر دیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ جب اعلیٰ سطح پر اٹھایا گیا تو سکول انتظامیہ نے یہ کہہ کر بات دبا دی کہ اس طرح اساتذہ اور طالبات کی بدنامی ہو گی۔ چنانچہ لڑکی کو پاس کر کے اگلی کلاس میں بھیج دیا گیا۔

ہمارے محلہ میں ایک لڑکا رفیق رہتا تھا جس کے اپنی پڑوسن اور میٹرک کی طالبہ جمیلہ سے تعلقات تھے دونوں کے والدین نے انہیں باز رکھنے کی بسیار کوشش کی مگر بے سود دونوں نے اپنی ڈگر سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ رفیق کا والد راج گیری کا کام کرتا تھا وہ اسے اپنے ساتھ کوئٹہ لے گیا جبکہ جمیلہ کے گھر والوں نے اس کی شادی کر دی۔ فریقین کا خیال تھا کہ دوری دونوں کے سروں سے عشق کا بھوت اتار دے گی۔ مگر مرض دوا کرنے کے ساتھ بڑھتا گیا اور رفیق باپ کو جل دے کر کوئٹہ سے چنیوٹ آ گیا اور ایک آٹو ورکشاپ میں کام سیکھنا شروع کر دیا۔ اس دوران رفیق اور جمیلہ کی ملاقاتیں پھر سے ہری ہو گئیں۔ چنانچہ جمیلہ نے طلاق' اور رفیق نے اپنے استاد کی مدد لے کر نکاح کر ڈالا۔

ربوہ کے ایک حکیم صاحب کے پڑوس میں ملتان کا ایک لڑکا شاکر اپنی ماں کے ہمراہ قیام پذیر ہوا۔ حکیم صاحب نے اپنی تربیت کے مطابق اس سے ملاقات کی اور پوچھا کہ "بیٹے آپ احمدی ہیں" جواب ملا "نہیں" حکیم صاحب نے فورا" اسے تبلیغ کرنے کا فیصلہ کیا اور "مرزا غلام احمد" کی نبوت ان کے خلفاء کے بارے میں جملہ کہانیاں سنا ڈالیں۔ شاکر اگرچہ مذہبی ذہنیت رکھنے والا مسلمان نہیں تھا' تاہم اسے

مرزائیت سے بھی کوئی رغبت نہیں تھی۔ حکیم صاحب نے اسے مسجد اور دیگر اجلاسوں میں آنے کی بہت پیشکش کی مگر وہ ہر بار طرح دے جاتا۔ ایک دن حکیم صاحب نے اسے گھر بلایا اور ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ابھی تبلیغ کا باب دوبارہ شروع ہوا ہی تھا کہ حکیم صاحب کی بیٹی چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ بس پھر کیا تھا شاکر لڑکی کو دیکھتے ہی دم بخود ہو گیا "اتنی حسین لڑکی شاید میں نے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں" خود کلامی کے انداز میں وہ بڑبڑایا۔ حکیم صاحب نے یہ صورت حال دیکھی تو کہنے لگے "بیٹے! یہ میری بیٹی طاہرہ ہے اس سال فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی ہے"۔ شاکر طاہرہ کے حسن قیامت خیز میں اس قدر کھویا کہ اس نے حکیم صاحب کی شبینہ روز تبلیغ کو گوارہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا "حکیم صاحب! مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگی ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ تمام باتیں مجھے رفتہ رفتہ بتائیں اور سمجھائیں"۔ حکیم صاحب تیار ہو گئے۔ یوں اس نے ایک مقررہ وقت پر ان کے گھر جانے کا معمول بنا لیا۔ حکیم صاحب ایک نیا احمدی جماعت میں لانے میں مگن تھے جب کہ شاکر ترچھی نگاہوں سے طاہرہ کو تسخیر کرنے میں مصروف تھا۔ حکیم صاحب کی مسلسل کوشش کے باوجود شاکر مرزائی تو نہ ہو سکا، مگر طاہرہ اس کے دام محبت میں آ گئی۔ شاکر طاہرہ سے تعلق برقرار رکھنے اور حکیم صاحب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے "نیم مرزائی" ہو گیا۔ ان دونوں کی دوستی اور محبت کا حکیم صاحب کو بھی علم تھا مگر وہ شاکر کے مکمل مرزائی ہونے تک سب کچھ گوارا کرنے پر تیار تھے جبکہ شاکر انہیں ٹالنے کے لئے نت نئے بہانے بنا لیتا۔ کبھی کہتا میں اپنی تعلیم مکمل کر لوں، پھر مرزا ناصر کی بیعت کر لوں گا۔ فوری طور پر بیعت کرنے پر مجھے گھر والے عاق کر دیں گے۔ حکیم صاحب اس کی دلیلوں کو مانتے رہے اور اپنے گھر آنے جانے سے نہ روکا۔ اس دوران وہ اپنا مقصود بھی حاصل کرتا رہا۔ یوں اس نے پہلے ایف۔ اے پھر بی۔ اے کر لیا اور مرزائیت پر لعنت بھیجتا ہوا واپس ملتان چلا گیا جبکہ حکیم صاحب اور طاہرہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

ایک لڑکی نور النساء ڈار کی داستان بھی مدتوں ربوہ کے کوچہ و بازار کا شاہکار بنی

رہی۔ جن دنوں نیا نیا ٹی وی آیا تو ربوہ کے متمول گھروں کی چھتوں پر بلند و بالا انٹینے لگے نظر آتے تھے۔ جماعت کی طرف سے بالا بلندیوں کو ٹی وی رکھنے کی سختی سے ہدایت تھی۔ ٹی وی پر جب ہفتہ وار فلم لگتی تو جماعت کے امراء ' غرباء ہم مذہبوں کو اجتماعی طور پر فلم دیکھنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ یہ بات میرے ذاتی مشاہدے میں ہے کہ ہم نے بھی حوروں کے جلو میں بیٹھ کر پرانی فلم "جھومر" دیکھی تھی۔

غلہ منڈی بازار میں ایک جنرل سٹور کا مالک عبدالباسط انتہائی وجیہ اور خوبرو نوجوان تھا۔ کبڈی کے اس کھلاڑی کی ایک لڑکی بشریٰ کے ساتھ گہری چھنتی تھی۔ ویسپا پر دونوں کھلے عام گھومتے۔ بشریٰ اپنی سہیلیوں کے جلو میں دکان پر شاپنگ کرنے آتی تو جو دل چاہتا' سمیٹ کر لے جاتی۔ اس دریا دلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد دکان خالی ہو گئی۔ تو بشریٰ نے بھی اپنا رخ زیبا موڑ لیا۔ موصوف دن بھر کوئے جاناں کی خاک چھانتا لیکن وہ پری رو تو جیسے گم ہو گئی۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ بشریٰ اس کے ساتھ فلرٹ کر رہی تھی۔ حالانکہ اس کا نکاح تو پہلے ہی کہیں ہو چکا تھا۔

مبارکہ بیگم محکمہ تعلیم کی ملازم تھی جس نے طلاق لینے کے بعد دوسری شادی نہ کی۔ حالانکہ کئی مرزائی رشتے اس کے ساتھ "جڑنے" کے لئے پر تول رہے تھے۔ لیکن اس نے کسی کو گھاس نہ ڈالی۔ اس کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ وہ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام سے جو کام چاہے کروا لیتی ہے۔ مخالفین سے تبادلوں کے ذریعے انتقام لینا اس کا معمول تھا۔ ربوہ کے "خاندان" کے سرگردہ افراد ہوں یا مسلمان جاگیردار اس کی "لطف کرم" سب کے لئے یکساں تھی۔

غلمان

"سدومیت اور گے کلچر" ربوہ کی آل نبوت اور امت کے تشخص کا لازمی جزو ہے۔ القابات اور الہامات کی رداؤں میں لپٹی ہوئی اس "ذریت مبشرہ" کا یہ کردار مرزا غلام احمد کے الہامات کی ساری حقیقت کھول کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے غایت تحریر میں مرزا طاہر کی احمدیہ نیٹ ورک ٹیلی ویژن پر کی گئی ایک تقریر کا حوال دیا ہے جس میں انہوں نے پاکستانی علماء کرام' خطیبوں اور مساجد کے اماموں پر اغوا' زیادتی' اغلام اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام لگائے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں خود کو پاکیزہ اور پوتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات اس "دروغ گو" مرزا طاہر کے لئے جس کا حافظہ ختم ہو چکا ہے' ایک آئینہ ہے جسے دیکھ کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا۔

یوں تو قصر خلافت ربوہ کے در و دیوار پر بنات امت کے ساتھ کیے جانے والے "پاکیزہ" اعمال کی کہانیاں ہی ربوہ کی آل نبوت کے کردار کا تجزیہ کرنے کے لئے کافی ہیں لیکن اس امت کے "مسلک ہم جنس پرستی" پر روشنی ڈالنی بھی ناگزیر ہے۔ تاکہ ان لوگوں کو پتہ چل جائے کہ سیٹلائٹ پر "کف" اور شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر سنگ و خشت برسانا آسان نہیں کہ وہ بھی اندرون خانہ کی پوری پوری خبر رکھتے ہیں۔

ہماری کلاس میں پڑھنے والے خانوادگان مرزائی نبوت کے تین سپوتوں' مرزا طیب' مرزا احسن اور سید قمر سلیمان کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ ہم لوگ نویں جماعت میں پڑھتے۔ کسی بات پر ان تینوں کی آپس میں لڑائی ہو گی۔ تیز گفتگو' دشنام طرازی سے ہوتی ہوئی کردار تک جا پہنچی۔ تینوں نے ایک دوسرے کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ خانساموں ماشکیوں اور گھر کے ملازموں کے علاوہ کزنوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ایک دوسرے کی "سدومیت داری" کی داستانیں سنا دی گئیں۔ پوری کلاس

نہایت دلچسپی سے جھوٹے نبی زادوں کے کردار کی حکایتیں سن رہی تھی۔ اسی دوران ماسٹر احمد علی کلاس میں تشریف لائے۔ انہیں دیکھ کر بھی شاہی خاندان کے ''اصیلوں'' نے زبان کو لگام نہ دی اور باہمی کردار و اخلاق کی دھجیاں بکھیرتے رہے۔ ماسٹر احمد علی بھی سدوی صفات سے مالا مال تھے اور ''اپنی امت'' کی اس روایت پر پوری طرح عمل پیرا رہتے تھے۔ تاہم ''مرزوں'' کو بھری کلاس کے سامنے ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے دیکھا تو کہنے لگے:

> ''دیکھو صاحب زادو! اگر نبیوں کی اولادیں ہی آپس میں اس طرح تھوکا فضیحتی کرنا شروع کر دیں گی تو امت کے ان طلباء کا کیا بنے گا' جنہوں نے اپنے کردار کو آپ لوگوں کے طرز عمل کی مثال سے سنوارنا ہے''۔

نبی زادے لڑتے رہے۔ ماسٹر احمد علی انہیں خاموش کرانے میں جب ناکام ہو گئے تو معاملہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے نہ جانے کس طرح تینوں کو ''کول ڈاؤن'' کیا۔ لیکن اس دوران ان کی لڑائی سے قصر خلافت کے شہزادوں کی اصلیت اور ان کی ''کردار کہانی'' کھل کر سامنے آ گئی۔ کلاس کے ایک طالب علم ظفر باجوہ نے اس صورت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا نبی زادوں نے ماشکیوں اور خانساموں کا تو زور و شور سے ذکر کیا لیکن میرے سمیت سکول کے بہت سے ساتھیوں کا تذکرہ کرنا ہی بھول گئے جن کا ان شہزادوں کی خدمت میں برابر کا حصہ ہے۔

فیکٹری ایریا محلہ میں ہمارا ایک کلاس فیلو اعجاز اکبر رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے اپنے محلے کی دو انتہائی سرکردہ اور مذہبی اکابر شخصیات کا تذکرہ سناتے ہوئے کہا کہ مولانا غلام باری سیف اور قانون دان سعید عالمگیر کی آپس میں گہری چھنتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے دونوں اپنے ذوق طبع کی تسکین کے لئے ایک دوسرے کے بیٹوں کو تختہ مشق بناتے ہیں۔ شہر کے در و دیوار ''نونہالان جماعت'' کے باہمی اختلاط کے قصوں سے سیو رہتے تھے۔ ''دھگو تے ابرار والی'' نظم تو مدتوں نوشتہ دیوار بنی رہی تھی جو دو نہالوں

کی سیاہ کاری کی ترجمان تھی۔

جسم فروشی کا رجحان اس قدر زیادہ تھا کہ ہر خوش شکل لڑکا ایک چلتا پھرتا "بروتھل" تھا۔ ایسے طلباء جن کے والدین اپنی قلیل آمدنی سے جماعت کا "دوزخ" بھرتے اور اپنی اولاد کی ادنیٰ سی خواہش بھی پوری نہیں کرپاتے تھے' ان کے بچوں کے لئے پیسہ کمانے کے لئے یہ آسان ترین راستہ تھا۔ بے شمار لڑکے کھلے عام "معاملہ" طے کرتے اور چل پڑتے تھے۔ والدین اور اساتذہ کی اکثریت اپنے بچوں اور طلبہ کی ان "مصروفیات" سے آگاہ تھی۔ تعلیمی اداروں میں تمام اساتذہ نے اپنے اردگرد "خوبرو طلبہ کی منڈلی بنا رکھی ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کے گروپ سے "لڑکا" توڑنا ایک معرکہ سمجھا جاتا تھا۔ اس قبیح عمل کی بجا آوری کو یہ لوگ اپنے آباء کی سنت اور اتباع خیال کرتے تھے۔

گول بازار کے ایک بہت بڑے دکاندار کا بیٹا شبیر شاہ بھی ہمارا کلاس فیلو تھا۔ وہ بھی اپنے نبی کی تعلیمات پر پوری طرح عمل پیرا رہتا تھا۔ لیکن اس بے چارے کے ساتھ عجیب قسم کا "دھرو" ہوگیا جس کی صفائیاں دیتے ہوئے اس کی زبان تھک گئی مگر رسوائی کی داستان پھر بھی ہر کوچے میں جا پہنچی۔ قصہ یہ تھا کہ شبیر شاہ ایک شخص کے ساتھ طے شدہ پروگرام کی خلاف ورزی کر کے کسی اور کے ہاں جا پہنچا۔ اول الذکر نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ایک منصوبے کے تحت "خصوصی لمحات" کی تصاویر بنا کر سکول میں تقسیم کر دیں۔

تصاویر کے ذریعے بلیک میلنگ کی دھمکی عام تھی۔ اکثر شہری اس سے کام نکال لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تیزاب سے چہرہ داغ دینے کی دھمکی بھی کام کر جاتی تھی۔ "مساجد" "جائے نماز" کے علاوہ جائے عمل بھی تھیں۔ مرزا ناصر کا زمانہ گزر چکا تھا مگر مرزا طاہر کے بے شمار ہم جولی "مرزا تاری" کے ساتھ گزارے ہوئے "شب و روز" پر نازاں ہوا کرتے تھے۔ مرزا لقمان کی "صحبت" سے فیض یاب ہونے والے بھی خود کو امت کے برہمن خیال کیا کرتے تھے۔ علی ہذا القیاس ربوہ "شہر سدوم" جہاں بسنے والوں

کا مذہب سدومیت ہے جسے ہر کس و ناکس نے اپنے دائرہ کار میں اختیار کر رکھا تھا۔

مولوی محمد ابراہیم بھانبڑی ہمارے سکول کے استاد اور بورڈنگ ہاؤس کے وارڈن تھے۔ ان کی "نگاہ لطف و کرم" ہر لڑکے پر یکساں ہوتی۔ تاہم لڑکوں سے وصول کیے ہوئے جسمانی خراج کا حساب ان کے بیٹے انور بھانبڑی کو چکانا پڑتا تھا۔ مولوی صاحب اپنی افتاد طبع سے اس قدر مجبور تھے کہ بعض اوقات ان سے کئی حرکات کھلے عام ہی میں سرزد ہو جایا کرتی تھیں جن سے انہیں شرمندگی اٹھانے کے علاوہ سکول انتظامیہ کی طرف سے محتاط رویہ اختیار کرنے کا نوٹس آ جایا کرتا تھا۔

تعلیم الاسلام کالج میں دو لڑکوں امین الدین اور طیب عارف کے حسن کے اس قدر چرچے تھے کہ ہر شخص ان سے بات کر کے اور ہاتھ ملا کے اپنے نصیب پر ناز کیا کرتا تھا۔ امین الدین کے فرسٹ ایئر میں داخلے کے بعد تمام اساتذہ کے دل مچل رہے تھے کہ کاش انہیں اس کی کلاس مل جائے۔ یہ لڑکا جب سامنے سے گزرتا تھا تو لڑکے با جماعت یہ گیت گایا کرتے تھے۔ "تک چن پیا جاندا ای" طیب عارف کے رخسار کے تل پر تو یار لوگ شاعرانہ ماحول بنا لیتے ۔ ہر شخص بساط بر اشعار اس "تل" کی نذر کر دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی "امرد" ایسے تھے جن کے حسن کے قصیدے ربوہ کی "گے" سوسائٹیوں میں پڑھے جاتے تھے۔ یہ تو چیدہ چیدہ لوگوں کے قصے ہیں ورنہ یہاں کا ہر فرد سدومیت کو اختیار کر کے فخر محسوس کرتا ہے۔ اگر فردا" فردا" داستانیں لکھی جائیں تو کئی دفتر تصنیف ہو جائیں۔

تعلیم الاسلام کالج کے ایک پرنسپل چودھری محمد علی بھی اس کھیل کے مرد میدان تھے۔ فضل عمر ہوسٹل کی وارڈن شپ کے دوران ان کی "داستان سدومیت" ہوسٹل اور وارڈن خانے کے در و دیوار پر رقم رہی۔ پرنسپل بننے کے بعد وہ مرزا ناصر احمد والی بڑی کوٹھی کے مکین بنے تو وہاں انہوں نے مرزا ناصر احمد اور ان کے کارناموں کو زندہ رکھا۔ بعض اوقات انتہائی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی جب پرنسپل کے ساتھ ساتھ جانے والے کسی بھی "خوش رو" لڑکے کو اس کے ساتھی دیکھ لیتے' بعد میں

"یاروں" میں بیٹھ کر اسے وضاحتیں کرنا پڑ جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جو لڑکا چودھری صاحب کے گھر سے آتا ہوا نظر آ جاتا' اس پر تو مدتوں "انگلیاں" اٹھتی رہتی تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود پرنسپل کا بلانا اور پری جمالوں کا ان کے گھر بلا تامل چلے جانا کسی دور میں بند نہ ہوا۔

ربوہ کے ملاں و پیر اور میر و وزیر ہر قسم کی اخلاقی مذہبی اور سماجی قید سے آزاد ہیں۔ وہ خوش وقت ہونے کے لئے صنف موافق و مخالف کی تفریق نہیں کرتے۔ دونوں اجناس ان کے ہاں ارزاں اور وافر ہیں۔

نام نہاد صحابیوں کی افراط

قدرت اللہ شہاب نے اپنی تصنیف "شہاب نامہ" میں ایوب چوک جھنگ کے ایک موچی کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ جس کی خودداری کو سابق صدر ایوب خان نے بھی خراج تحسین پیش کیا تھا! ربوہ کے رحمت بازار میں ولی محمد کی آٹا پیسنے والی چکی کے پاس ایک سلیم موچی کا "تھڑا" تھا۔ یہ شخص نہایت سچا' کھرا' دیانتدار اور با اخلاق تھا۔ میں نے گزشتہ اوراق میں کئی ایک مرزائیوں کا ذکر کیا ہے' جو مرزائیت کے بدنما وجود میں نہ صرف اجلے اور علیحدہ نظر آتے تھے بلکہ انہیں مرزائی کہتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ کاش یہ لوگ مرزائی نہ ہوتے۔ سلیم موچی کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہوتا تھا۔ سلیم ابا جی کی بہت عزت کرتا تھا۔ ہم لوگ اسے اکثر کہا کرتے تھے:

> "سلیم ! تم شکل و عادت سے مرزائی نہیں لگتے۔ پھر تم ان بدبختوں میں کہاں آ پھنسے ہو"۔
>
> ہمیشہ کی طرح سلیم مسکرا دیتا اور کہتا "دیکھیں جی ماں باپ احمدی تھے۔ میں بھی احمدی بن گیا۔ وہ کچھ اور ہوتے تو کچھ اور بن جاتا"۔

سلیم کو کئی بار ابا جی نے مسلمان ہونے کی پیشکش کی لیکن وہ انکار کیے بغیر خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ ایک روز میں سلیم کی دکان پر کھڑا تھا کہ وہاں ایک بہت ہی بوڑھا سا شخص آ کر بیٹھ گیا۔ اس شخص کی زبان کپکپا رہی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا۔ اتنے میں اور لوگ بھی اس بوڑھے کے پاس آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سلیم کی دکان کو لوگوں کے ایک گول دائرے نے گھیر لیا۔ ہر شخص بوڑھے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اصرار کر رہا تھا:

"باباجی کچھ باتیں سنائیں اپنے زمانے کی"۔

کانپتی آواز میں بابے نے کہا "ٹھہر جاؤ اوئے منڈیو! مینوں ساہ تے لین دے او"۔ قدرے تامل کے بعد بابے نے "مرزا غلام احمد" کے بارے میں مختلف قصے اور قادیان کی کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ اسی دوران اس نے سیلاب کے دنوں کا ایک لطیفہ بھی سنا ڈالا۔ لطیفہ انتہائی غلیظ تھا۔ مجھے اتنے بزرگ بندے کے منہ سے ایسا لطیفہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر تمام سامعین اس لطیفے پر قہقہے لگا رہے تھے اور کہہ رہے تھے "باباجی اک ہور سنو"۔

بابا اپنے "نبی" کے تذکرے کو غلیظ لطیفوں کے ساتھ مکس کر کے کوئی گھنٹہ بھر اپنے ماننے والوں کو محظوظ کرتا رہا۔ اس دوران اس کے لئے دودھ کا ایک بھرا ہوا پیالہ لایا گیا جو اس نے پیا اور کہا "ہٹو اوئے منڈیو! ہن مینوں جان دیو"۔

بابا چلا گیا۔ میں نے سلیم سے پوچھا یہ بابا کون تھا؟ سلیم حسب معمول مسکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' ایک اور شخص مجھے سرزنش کے انداز میں کہنے لگا "اسے بابا مت کہو' بلکہ باباجی کہو' یہ تو ہمارے حضرت مسیح موعود کے صحابی ہیں۔ انہیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ یہ تو کبھی موج میں آ جائیں تو بات کرتے ورنہ تو لوگ ان کی باتیں سننے کو ترستے ہیں"۔

"صاحابی" میں نے ذرا لمبا کر کے کہا' اور سٹپٹا کر رہ گیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سلیم سے کہا "صحابی کا درجہ تو وہ ہوتا ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا۔ جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ' ان کی گفتگو کا حرف حرف ایک درس اور مشعل راہ تھا۔ یہ کیسا صحابی ہے جس نے اتنے بیہودہ لطائف سنا ڈالے اور لوگ واہ واہ کر رہے ہیں"۔ اس سے پہلے کہ مذکورہ شخص کے ساتھ میری تو تکار ہو جاتی' سلیم نے نہایت معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات کو سنبھال لیا اور جب وہ شخص چلا گیا تو سلیم کہنے لگا "بھیا! تم خواہ مخواہ ان پھڈوں میں نہ پڑا کرو' ہر شخص کی عقیدت کا اپنا معیار ہوتا ہے انہیں یہی پسند ہے پھر لڑنا کیسا"۔

میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ جس نبی کا یہ صحابی ہے' وہ "نبی آخر کیسا ہو گا" کیونکہ مرزا غلام احمد کے مختصر سے مختصر کلام میں بھی زیادہ سے زیادہ دشنام شامل رہی ہیں۔ چنانچہ اس کے مصاحب جیسے پڑھے ہیں' ویسے ہی پڑھائیں گے۔

مجھے ذاتی طور پر بھی مرزائیوں کے ایک نیم صحابی سے ملاقات کا پالا پڑا۔ یہ شخص بھی کوئی ۸۰ کے پیٹے میں تھا۔ اس کی زبان کترنی کی طرح چلتی تھی۔ اس کے ہر موضوع کی تان آ کر "سیکس" پر ٹوٹا کرتی تھی۔ اس کے پاس کوئی بھی شخص آ کر بیٹھتا' یہ اس سے جنسی موضوعات پر بات چیت کر کے خوش وقت ہوتا۔ ایک دن کہنے لگا میں اگرچہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسان "خصی بیل" جیسے حال میں ہوتا ہے لیکن میرے اندر زندگی کے تمام تر "کرنٹ" موجود ہیں۔ اب بھی میں بس' ریل یا تانگے میں بیٹھوں تو عورتیں بالخصوص نو عمر لڑکیاں مجھے بوڑھا آدمی سمجھ کر ساتھ بٹھا لیتی ہیں۔ ان کے خیال میں' میں بے ضرر سا بوڑھا ہوں حالانکہ صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ میرا تو رواں رواں اس وقت عمر رفتہ کو صدائیں دے رہا ہوتا ہے اور مجھے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے جو میری عمر کا اقتضا نہیں ہے۔

ربوہ میں مجھے "مرزا غلام احمد" کے ایک اور صحابی کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہ سال خوردہ شخص اپنی عمر کی سنچری بنانے والا تھا۔ سرخ سر اور داڑھی والا سیاہ رو بابا "آرے آرے تیرے گھرتے مینارے" کہلاتا تھا۔ اسے سوہنی' موہنی اور کومل سی لڑکی سے شادی کا بے حد شوق تھا۔ ایک روز میں سکول سے واپس آ رہا تھا تو اپنی گلی کی نکڑ پر بڑے چھوٹے لوگوں کا ایک مجمع دیکھا جس میں سفید شلوار قمیص اور شملے دار پگڑی والا ایک پستہ قد بوڑھا کھڑا دعا مانگ رہا تھا جب کہ سب لوگ اونچی آواز میں آمین کہتے جا رہے تھے۔

دعا کا خلاصہ یہ تھا۔

"اے اللہ مجھے اتنی دولت دے کہ میں اس کے ڈھیر کے نیچے دب جاؤں۔ مجھ سے نکلا نہ جائے۔ لوگ آ کر مجھے نکالیں۔ پھر

مجھے ایک بڑا سا گھر دے جس میں باغ ہوں' باغیچے ہوں اور پھول کھلیں۔ بہت سے نوکر چاکر اور کنیزیں اس گھر میں چلتی پھرتی نظر آئیں۔ میں ایک کو بلاؤں تو ساری بھاگی چلی آئیں -------
اس گھر میں ہر وقت مختلف انواع کے لذیذ کھانے پکیں۔ اے اللہ میاں جب یہ ساری چیزیں آ جائیں تو پھر اس گھر میں ایک بہت ہی چھوٹی سی عمر کی نازک سی' شرمیلی سی' خوبصورت سی لڑکی بھیج دے جو مجھ پر فریفتہ ہو جائے۔ وہ مجھے کہے کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔ میں کہوں نہیں۔ وہ مناتی جائے میں انکار کرتا جاؤں اور پھر میں مان جاؤں۔ جب ہماری شادی ہو جائے تو ہم ہنسی خوشی سکھی اس گھر میں رہیں اور دن رات یہ گانا گائیں
"آرے آرے تیرے گھرتے منارے ----- آرے آرے تیرے گھرتے منارے"۔

دعا ختم ہونے کے بعد بابے نے یہ گانا شروع کیا تو لوگ بھی ساتھ گانا گانے لگے۔ پھر "بابے" نے دھمال ڈالنی شروع کر دی۔ وہ اتنا ناچا کہ کیا کوئی جوان ناچے گا۔ رقص و سرود ختم ہوا تو میں نے اپنے ایک پڑوسی انیس احمد سے پوچھا یہ کون تھا تو کہنے لگا یہ ہمارے حضرت صاحب کے صحابی تھے۔ اس کے بعد میں نے شہر میں اکثر اس بڈھے کو پھرتے دیکھا جو لوگوں کو دیکھتے ہی اپنا راگ "آرے آرے تیرے گھرتے منارے" الاپنا شروع کر دیتا تھا۔ جس کے جواب میں لوگ اسے پیسے دیا کرتے تھے۔ اسے دیکھ کر منہ سے بے ساختہ نکلتا "صحابی نہ ہوا بھکاری ہوا"۔

ہماری گلی میں بلکہ گھر کے بالکل سامنے دو کچے سے مکان تھے۔ ایک میں معذور شخص چاچا محمد حسین رہتا تھا جبکہ دوسرے میں اسلم چھن اور اس کا بھائی اچھو اپنی والدہ کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ اس مکان کا مالک ایک بوڑھا ضعیف آدمی تھا جس کو لوگ "بابا جل جل" کہا کرتے تھے۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں کہ یہ بابا خود کہاں رہتا تھا

لیکن کبھی کبھی جب آتا تو لوگ اسے بھی "نیم صحابی" کہا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد کا یہ صحابی جب بھی آتا اپنے کرایہ داروں کو انتہائی غلیظ گالیاں دیتا اور مکان خالی کرنے کے لئے کہا کرتا تھا۔ ایک بار تو اس نے اندھیر ہی مچا دیا۔ اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لایا اور چاچا محمد حسین کے گھر والوں کو مکان خالی کرنے کو کہا۔ انہوں نے منت سماجت کر کے مہلت جو مانگی بس پھر کیا تھا۔ بابا بپھر گیا اور گالیوں کی بھرمار کر دی۔ اپنا لٹھ نما ڈنڈا در و دیوار پر برسانے لگا۔ کمانڈر کی طرف سے فائر کرنے کا حکم ملنے کی دیر تھی، اس کے ساتھ آئے ہوئے حواریوں نے بیچارے محمد حسین کے گھر کا سامان باہر پھینک دیا۔ یہ لوگ رات بھر گلی میں رہے اور اگلے دن نہ جانے کیسے سر چھپانے کے لئے کوئی کوٹھڑی تلاش کی۔ "بوڑھے بل جل صحابی" نے مکان گروا کر اس کی جگہ نیا مکان تعمیر کروایا۔ اس میں زیادہ کرایہ دینے والے کرایہ دار رکھ لئے۔ یہ تھا "مرزا غلام احمد" کے صحابیوں کا کردار۔ حالانکہ صحابی تو اچھی صحبت کے باعث لوگوں پر مہربان ہوتے ہیں اور خود دکھ اٹھا کر خلق خدا کو سکھ پہنچاتے ہیں۔

ربوہ میں ہر دوسرا تیسرا ضعیف و نحیف بوڑھا خود کو صحابی یا نیم صحابی کہلا کر اتراتا پھرتا تھا۔ ہمارے سکول کے ایک لڑکے کا دادا بہت بوڑھا تھا۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت تاہم یہ بابا ہر کسی کو گالیاں خوب دیا کرتا تھا۔ اس کی دشنام طرازی سے بچنے کے لئے بابے کی آل اولاد نے اسے ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ ایک دن دروازہ کھلا رہ گیا اور بابا کسی طرح گھر سے باہر نکل آیا اور گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ کر ہر آنے جانے والے کے شجرہ نسب پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ بابے کے گھر والوں نے اسے گھر کے اندر لے جانے کی کوشش کی تو اس نے انہیں اینٹیں مارنی شروع کر دیں۔ آخر کار شام کو بابا تھک ہار کر گھر کے اندر چلا گیا تو اس کے گھر والوں نے اسے کمرے میں بند کر کے "لاک" لگا دیا۔ لوگوں نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ یہ بابا جی کون تھے تو جواب دیا گیا یہ ہمارے ابا جی اور حضرت مسیح موعود کے صحابی ہیں۔

میرے کئی کلاس فیلو بہت کٹر مرزائی ہونے کے باوجود "مرزا غلام احمد" اور اس

کی ذریت کے بارے میں میرے خیالات کو درست تسلیم کرتے تھے۔ میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا "یار! یہ صحابی کا کیا چکر ہے۔ تمہارے شہر میں ہر گھر سے کوئی نہ کوئی صحابی نکل آتا ہے"۔ موصوف نے کہا "یار تم ان چکروں میں نہ پڑا کرو کون کیا ہے؟ یہ صرف اللہ جانتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خود کو صحابی کہہ کر دل پشوری کر لیتا ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے یہاں تو ایک اینٹ اٹھاؤ' اندر سے صحابیوں کے "اجڑ" نکل آئیں گے۔ کیونکہ ربوہ میں یہ فیشن ہے کہ ہر شخص "خاندان نبوت" سے قرابت داری ظاہر کرنے کے لئے اپنے باپ دادا کو صحابی یا نیم صحابی کا درجہ دے ڈالتا ہے"۔

گھونگٹ کی ہوا

مرزا محمود احمد نے دنیا سے کوچ کیا تو مرزا ناصر احمد تعلیم الاسلام کالج کی پرنسپل شپ چھوڑ کر عازم قصر خلافت ہوئے۔ مرزا رفیع احمد اور مرزا ناصر احمد کے درمیان خلافت کا میچ پڑا۔ دونوں کے ووٹ برابر تھے مگر دھاندلی سے "فرشتوں" کے ووٹوں نے مرزا ناصر احمد کا مینڈیٹ بھاری کر دیا اور یوں کالج کا پرنسپل "اپنی امت" کا خلیفہ بن گیا۔

۱۹۶۵ء خدا حافظ ہونے کو پر تول رہا تھا جب میں نے پہلی بار مرزا ناصر احمد کو دیکھا۔ خلیفہ بننے کے بعد انہیں ہمارے سکول میں مدعو کیا گیا۔ سکول کے بشیر ہال میں ان کا خطاب ہوا۔ خطاب کیا تھا' میں نے کان ہی نہ دھرا دراصل مجھے مرزائیوں کی تقاریر اور ان کے خانوادہ نبوت کے برز جمہوں کی تصاویر سے کوئی رغبت نہیں۔ ان کے خطاب اتنے بور ہوتے ہیں نہ جانے یہ بد ذوق اہل جماعت کیسے سنتے اور برداشت کرتے ہیں۔ ان کی تقاریر عیسائیوں سے محبت نما نفرت' یہودیوں کی کاسہ لیسی' انگریزوں اور ہندوستانیوں کے قصائد اور ڈاکٹر ڈوئی کے نام نہاد فسانوں کا ملغوبہ ہوتی تھیں۔ میں نے مرزائیوں کی کوئی کتاب سرورق کے علاوہ نہیں پڑھی کیونکہ یہ سب خرافات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ میرا فلسفہ یہ ہے کہ جو حقیقت دلیل کی محتاج ہو' وہ آدھی حقیقت ہوتی ہے۔ مرزائیوں کے بارے میں یہ نکتہ نظر ہی کافی ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ لہٰذا یہ جاننے کے لئے ان کی کتابیں پڑھنا یا ان کے علماء کے واعظ سننا کہ شاید مرزائی سچے نہ ہوں پرلے درجے کی احمقانہ حرکت ہے۔ میں انہیں شروع دن سے جھوٹا سمجھتا ہوں اور یہی میرے دل کی آواز ہے۔ لہٰذا ان کی تقریر و تحریر سے مجھے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ ہاں تو مرزا ناصر احمد سے ملاقات کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ہوا یوں مرزا ناصر کے خطاب کے بعد ہر لڑکا باری باری سٹیج پر جا کر ان سے مصافحہ کر رہا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں

نے حسب عادت "نصف ہاتھ" ملایا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نصف ہاتھ ملانا بچپن سے میری لاشعوری عادت ہے۔ اکثر لوگ اسے تکبر بھی کہتے رہے ہیں حالانکہ ایسا نہیں۔ "میں کیا ہوں یہ میں جانتا ہوں اس لئے تکبر کیوں کروں"۔ اس غلطی پر مجھے اپنے گھر والوں سے بے شمار دفعہ ڈانٹ پڑ چکی ہے۔ اس کے باوجود لاشعوری طور پر یہ حرکت اب بھی کبھی کبھار مجھ سے سرزد ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جب میں نے مرزا ناصر سے آدھا ہاتھ ملایا تو اس موقع پر موجود ہمارے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم نے مرزا ناصر سے کہا "حضور!" آپ اس لڑکے کو جانتے ہیں یہ زراعت والے صوفی فضل کریم صاحب کا صاحبزادہ ہے۔ اس پر مرزا ناصر احمد نے مجھے کندھے سے پکڑ کر دوبارہ اپنی طرف موڑا اور کہا "بھئی آپ کے ابا تو بڑے پہلوان قسم کے انسان ہیں مگر آپ نے انتہائی بے جان انداز میں ہاتھ ملایا ہے۔ لاؤ پھر سے ہاتھ ملاؤ"۔ اس پر انہوں نے میرا پورا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تین مرتبہ زور سے ہلایا۔

ہیڈ ماسٹر ابراہیم اور دیگر اساتذہ جو میری قادیانیت سے بے اعتنائی سے خاصے واقف تھے، مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھ اور سوچ رہے تھے کہ شاید مرزا ناصر احمد کی یہ شفقت مجھ پر اثر انداز ہو جائے گی۔ بعد میں میرے ہم جولیوں نے کئی بار مجھے کہا "دیکھو ہمارے حضرت صاحب نے تمہیں کتنا وقت دیا اور تمہارے ساتھ شفقت فرمائی۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا؟" میں نے اپنا مخصوص جواب دے کر ان کے ارمانوں پر اوس ڈال دی اور کہا "بھئی اس میں متاثر ہونے والی کون سی بات ہے۔ مرزا ناصر احمد میرے ابا جی کے "یار" ہیں لہٰذا انہوں نے مجھے تم لوگوں سے زیادہ لفٹ کرا دی"۔

میں ۱۹۶۶ء میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سردیوں کے موسم میں میرے چہرے کی جلد خشک اور سخت ہو کر پھٹ جایا کرتی۔ بعض اوقات تو اس سے خون بھی رسنے لگتا تھا۔ ایک روز ابا جی مجھے چیک کرانے کے لئے فضل عمر ہسپتال لے جا رہے

تھے۔ ہم سٹیشن کی دوسری طرف دارالضیافت والی بغلی سڑک پار کر کے گول بازار جا رہے تھے کہ قصر خلافت اور امور عامہ کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر گاڑیوں کا ایک کارواں نمودار ہوا۔ واضح رہے مرزا ناصر احمد نے جب کہیں جانا ہوتا تھا تو قاعدے کے مطابق ان کا قافلہ تین موٹر سائیکلوں اور پانچ گاڑیوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ایک موٹر سائیکل آگے ہوٹر بجاتی جبکہ اس کے پیچھے دو موٹر سائیکلیں ہوتی تھیں۔ اس کے بعد ایک جیپ پھر کار درمیان میں نیلے رنگ کی شیورلیٹ کار جس میں پردے آویزاں ہوتے تھے۔ اس میں مرزا ناصر احمد اور ان کی اہلیہ منصورہ ہوتے جب کہ اس کے پیچھے دو محافظوں کی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ عبدالمنان صوبیدار اور حوالدار صالح محمد مرزا ناصر کے چیف سیکورٹی آفیسر ہوا کرتے تھے۔

ہم اس سڑک کے کنارے کنارے رواں تھے کہ مرزا ناصر احمد کا کارواں ہمارے پاس سے گزرا۔ نہ جانے کیسے' کب اور کیوں مرزا ناصر احمد نے گاڑی کا پردہ اٹھایا۔ بے ساختہ ان کی نظر اباجی پر پڑی اور مرزا ناصر احمد نے گاڑیاں روک دینے کا حکم دیا۔ گاڑیاں رک گئیں۔ مرزا ناصر احمد نے اباجی سے استفسار کیا "صوفی صاحب! کہاں جا رہے ہیں؟"

"بچے کو ہسپتال چیک کرانے کے لئے جا رہا ہوں"۔ اباجی نے جواب دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" مرزا ناصر نے پوچھا۔

میرا چہرہ دکھاتے ہوئے اباجی نے ساری کہانی کہہ ڈالی۔ مرزا ناصر احمد نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ میں نے پاؤں میں ہوائی چپل پہن رکھی تھی۔ ان دنوں اس چپل کا عام رواج تھا۔ مرزا ناصر احمد نے مجھے کہا "بیٹا! ہوائی چپل پہننا چھوڑ دو' چہرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا"۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ڈرائیور سے کوئی دوا طلب کی۔ اور پھر ہومیو پیتھک کی گولیوں سے بھری ہوئی ایک نیلی شیشی مجھے دے دی اور کہا کہ اب ہسپتال

جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت مرزا ناصر احمد کی بیوی منصورہ بھی حسب معمول ساتھ تھی۔

ربوہ کی تاریخ میں خلیفہ کی سواری کا کسی عام اور خاص طور پر غیر احمدی کے لئے رک جانا اپنی نوعیت کا واحد واقعہ تھا۔ اس وقت سڑک پر اور لوگ بھی تھے جو ہمارے مقدر پر رشک کر رہے تھے جب کہ ہم ان کی احمقانہ سوچ پر ماتم کر رہے تھے۔ اس بات کی ربوہ شہر میں دھوم مچ گئی۔ کیونکہ اہل ربوہ کے لئے یہ انوکھی بات تھی۔ وہ لوگ جو "خلیفہ صاحب" سے ملاقات کے لئے ہفتوں پہلے درخواست دیتے ہیں' پھر دنوں تک انہیں ملاقات کے لئے باری کا انتظار رہتا ہے' اس واقعہ پر حیران بھی تھے اور تلملا بھی رہے تھے کہ آخر "ہمارے حضور" ایک غیر مرزائی شخص پر اس قدر کیوں مہربان ہیں۔ جو ان عنایات خسروانہ کو خاطر میں لاتا ہے نہ جماعت میں داخل ہوتا ہے۔

سڑک پر کھڑے لوگوں نے ابا جی سے کہا "آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ اللہ نے آپ پر بڑا کرم کر دیا ہے۔ اب آپ کو بھی چاہئے کہ "احمدی جماعت میں شمولیت کر لیں"۔ ابا جی نے جواباً" کہا میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ اللہ پاک نے مجھے حضرت محمد و احمد ﷺ کا امتی بنایا ہے لیکن مجھے کیا پڑی ہے کہ میں ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے متاثر ہو کر اپنا دین چھوڑ دوں۔ کہنے والوں' جن کی ہمارے مرزائی ہونے کے لئے رال ٹپک رہی تھی' کے منہ لٹک رہے تھے۔

ایک بار ایک شخص نے جو مرزائی سنڈیکیٹ کا سرکردہ رکن تھا' ابا جی کو بتایا کہ مرزا ناصر سے کسی شخص نے شکایت کی کہ آپ کی صوفی فضل کریم پر بے پناہ عنایات ہیں لیکن وہ کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ آپ کسی طرح انہیں مرزائی کریں یا پھر ان کے ساتھ مروت آمیز سلوک ترک کر دیں۔ مرزا ناصر نے اسے جواب دیا "تم لوگوں کو صوفی صاحب کے مقام کا علم نہیں۔ ایسے بلند مرتبت لوگ مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے اوصاف ہر عامی نہیں سمجھ سکتا۔ ان کو سمجھنے کے لئے دیدہ بینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے مقام کے مطابق ان کی عزت کرتا ہوں"۔

میرے دادا جان میاں محمد بخش کا ۱۹۶۸ء میں انتقال ہوا تو مرزا ناصر احمد نے ابا جی کو خصوصی طور پر اپنے ہاتھ سے تعزیتی خط لکھا حالانکہ عام طور پر خلیفہ کی طرف سے جماعت کے لئے طبع شدہ تہنیتی اور تعزیتی خطوط ارسال کئے جاتے ہیں جن پر صرف پین سے مکتوب الیہ کا نام اور پتہ لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ خطوط ہمارے لئے کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے لہٰذا ہم نے سنبھال کر نہیں رکھے تھے۔ مرزا ناصر احمد' مرزا غلام احمد کا پوتا تھا جس نے قصر رسالت اور کاشانہ نبوت میں نقب لگائی لیکن یہ شخص ابا جی کو باقاعدہ خطوط تحریر کرتا جن میں دعا کی درخواست کی جاتی تھی۔ حالانکہ مرزائی دنیا کے باسی مرزا ناصر احمد سے دعا کی التجا کیا کرتے تھے۔

ایک بار ابا جی سے چند لوگوں نے کہا کہ مرزائی خلیفہ بلکہ "خاندان نبوت" کے دیگر چشم و چراغ آپ کا پیروں کی طرح احترام کرتے ہیں۔ آپ انہیں دعوت تبلیغ کیوں نہیں دیتے اور ان کے راہ راست پر آنے کے لئے دعا کیوں نہیں کرتے۔ اس پر ابا جی نے کہا "ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہے مگر جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہو وہ کیسے ہدایت پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا ناصر مرزائی سلطنت کا بادشاہ ہے۔ اپنا تخت و تاج اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ چنانچہ کسی حکمران کو حکومت چھوڑنے کے لئے کہا جائے تو وہ کبھی بھی نہیں مانے گا۔ یہی حال ان کا ہے۔ لہٰذا راندہ درگاہ لوگوں کو راہ پر لانے کے لئے کوشش کرنا فضول عمل ہے۔

ہمارے پڑوس میں مستری فضل دین آف سائبیریا کا گھر تھا۔ اس کا بیٹا ادریس احمد بشیر بھی ابا جی کا بہت معتقد تھا۔ ہر کام کرنے سے پہلے ان سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ ادریس کے بھانجے ہمایوں سلیم کی سالگرہ تھی۔ جس میں مرزا ناصر کو بطور مہمان خصوصی بلایا گیا تھا جب کہ ہم بھی تقریب میں مدعو تھے۔ میں اور میرے ابا جی تقریب میں شرکت کے لئے گھر سے نکل رہے تھے۔ عین اس وقت مرزا ناصر کی سواری ہمارے دروازے کے سامنے رکی۔ مرزا ناصر کی نگاہ ہم پر پڑی تو کہا:

"اخاہ صوفی صاحب! آپ یہاں رہتے ہیں؟"

"جی یہی میرا غریب خانہ ہے" اباجی نے کہا۔

"تو پھر پہلے آپ کے دولت خانے پر حاضر ہونا چاہیئے" مرزا ناصر نے کہا۔

"ضرور ضرور" اباجی نے کہا اور بیٹھک کھلوائی۔

دو کرسیوں اور ایک چارپائی پر مشتمل ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر " سکنجبین" نوش کی گئی اور پھر ہمارے ساتھ ہی ادریس کے گھر روانہ ہوئے۔ اس واقعہ پر بہت سے مرزائی جل بھن کر رہ گئے۔ کئی ایک نے اباجی سے کہا "دیکھیں نور کی برسات چل کر آپ کے گھر آگئی ہے مگر آپ کو نہ جانے کیوں کوئی اثر نہیں ہوتا"۔

اباجی نے کہا "احمقو! سوچو تو ذرا ' تمہاری نام نہاد نور کی برسات جس شخص کے گھر چل کر آئی ہے' اس کو بھی تو اللہ تعالیٰ نے کسی صلاحیت سے نوازا ہو گا جس کی بنا پر یہ سب کچھ ہوا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ ایسی برسات آئے یا جائے پتھر کو کبھی جونک نہیں لگ سکتی"۔

اباجی کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی کے ذاتی کام پر توجہ دینے کے بجائے امور سرکار باقاعدگی اور بر وقت انجام دینے کی پالیسی پر کاربند رہتے تھے۔ ان کے دور میں ربوہ کے نواحی علاقوں میں فصلوں کی پیداوار دوگنا ہو گئی۔ ربوہ جیسی کلر والی زمین جہاں پانی بھی کھاری تھا' وہاں اعلیٰ نسل کے پھل اور پھول دار پودوں نے نشوونما پائی ورنہ وہاں صرف جنگلی کیکر کے سوا کچھ اگتا ہی نہیں تھا۔ آپ اپنے حلقے میں ہر شخص کی زمینوں پر جایا کرتے تھے۔ فصلوں' پودوں اور زمین کا معائنہ کرتے' کاشتکاروں اور زمینداروں کو مشورے دیتے اور زمین زرخیز بنانے کے زرعی طریقے بتاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک روز وہ مرزا ناصر احمد سے محکمانہ ملاقات کرنے کے لئے قصر خلافت گئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ مرزا ناصر کے پرائیویٹ سیکرٹری ظہور باجوہ نے اباجی سے کہا "آج ملاقات کا دن ہے نہ آپ کی طرف سے ملاقات کی کوئی درخواست آئی ہے۔ جس پر خصوصی غور کیا جا سکے"۔ اباجی نے کہا ملاقات کی درخواست تب کی جاتی ہے جب اس کی

خواہش ہو۔ یہ ملاقات تو آپ کے خلیفہ صاحب کی ضرورت ہے۔ میں اپنی سرکاری ڈیوٹی نبھانے آیا ہوں۔ "ملاقات نہیں ہوتی تو نہ سہی" یہ کہہ کر ہم وہاں سے نکل آئے۔ ابھی گیٹ عبور بھی نہیں کیا تھا کہ ظہور باجوہ بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا "صوفی صاحب! آیئے حضور یاد فرما رہے ہیں"۔

"اب کیا ہوا" ابا جی نے پوچھا۔

"ہوا یہ کہ جب آپ نکلے ہیں تو انٹرکام پر میری "حضور" سے بات ہوئی تو میں نے آپ کا ذکر کر دیا جس پر انہوں نے کہا کہ "صوفی صاحب کو فوراً بلایا جائے"۔ ظہور باجوہ نے کہا۔

ہم واپس آ گئے۔ پھر ہمیں مرزا ناصر نے اپنے دیوان خاص میں بلایا۔ یہاں عجیب قسم کا طلسمی اور پر اسرار ماحول تھا۔ معطر اور سحر آفریں فضا میں یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی اور ہی دنیا ہو۔ یہاں ہی میں نے وہ طلسمی صندوق بھی دیکھا جسے زائرین اور ملاقات کے لئے آنے والے اپنے نذرانوں سے بھر دیا کرتے تھے۔

مرزا ناصر سے بات چیت کے دوران ابا جی نے ظہور باجوہ کے رویے کی شکایت کی تو اسے طلب کر لیا گیا۔ مرزا ناصر نے سرزنش کرتے ہوئے کہا "باجوہ صاحب! آپ ایک مدت سے پرائیوٹ سیکرٹری ہیں مگر افسوس ہے کہ آپ کو لوگوں کی پہچان نہیں ہوئی" صوفی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو یہاں آتے ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ نہ آئیں تو بھی ہم ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔۔ آپ ان سے معذرت کریں اور آئندہ ایسی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ ظہور باجوہ نے والد صاحب سے باقاعدہ معذرت کی۔

مرزا ناصر احمد بھی اپنے والد مرزا محمود احمد کی طرح تعدد ازدواج کے زبردست شوقین تھے مگر ان کی بیوی منصورہ نے ان کی لگام ایسے کھینچ کر رکھی ہوئی تھی' وہ ادھر ادھر منہ تو مار لیتے مگر اس کی زندگی میں دوسری شادی کوشش کے باوجود نہ کر سکے۔ لیکن جونہی منصورہ آنجہانی ہوئی تو مرزا ناصر نے اس لڑکی سے شادی رچا لی جو مرزا

لقمان کی محبوبہ تھی۔ باپ بیٹے میں بہت جنگ ہوئی۔ لقمان نے یہاں تک کہا "ابا حضور! بیچ میں نے بنائی مگر بیٹنگ آپ نے کر ڈالی" مرزا ناصر احمد نے نوجوان دلہن کی برابری کرنے کے لئے طب یونان اور ہومیو پیتھک کے کئی نسخے آزمائے۔ انہی نسخوں نے آخرکار انہیں جہنم واصل کر دیا۔ اکثر مرزائی **منچلے** کہا کرتے تھے کہ "ہمارے حضرت صاحب کو گھونگٹ کی ہوا لگ گئی ہے"۔

پلے بوائے

مرزا طاہر کو جب میں نے دیکھا وہ ایک مکمل "پلے بوائے" تھے۔ منہ میں پان' جیب میں کیپسٹن ڈالے سرخ رنگ کی لیڈیز سائیکل پر پھرنے والا یہ شخص شہر بھر کی خواتین کے دل کی دھڑکن تھا۔ عمر کی قید سے قطع نظر ہر خاتون ان سے تعلق و واسطہ پر فخر کیا کرتی تھی۔ نوجوان خواتین تو بڑے ناز سے انہیں "میاں تاری" کہا کرتی تھیں۔

مرزا طاہر بھی اپنے بڑے بھائی مرزا ناصر کی طرح ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ ان کا کلینک صبح اور شام کھلا کرتا جہاں ماہ رخان شہر کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ کسی خاتون کو کوئی مرض ہو یا نہ ہو' وہاں جا کر دل پشوری کر لیا کرتی تھی۔ کسی نوجوان لڑکی کے پیٹ میں ہلکا سا درد بھی اٹھتا والدین اسے تریاق لینے میاری تاری کے پاس بھیج دیا کرتے۔

۱۹۴۶ء کی شدید گرمیوں کی ایک صبح کو ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو گرے رنگ کی پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان سامنے کھڑا تھا۔ گورا رنگ' چہرے پر ہلکی اور بکھری بکھری سی ڈاڑھی تھی۔ جبکہ ہونٹ پان سے سرخ تھے۔ موصوف نے مسکراتے ہوئے کہا:

"آپ غالباً" صوفی صاحب کے صاحبزادے ہیں"۔

"کہاں جی بالکل ہوں"۔

"تو کیا صوفی صاحب گھر پر موجود ہیں" انہوں نے پھر پوچھا۔

"میں نے کہا' جی ابا جی گھر پر ہیں"۔

"انہیں اطلاع کریں کہ مرزا طاہر آئے ہیں"۔

میں نے "اچھا" کہا اور اندر جا کر ابا جی کو اطلاع کی۔ انہوں نے مجھے بیٹھک کھولنے کو کہا اور خود باہر چلے آئے اور مرزا طاہر کو لے کر بیٹھک میں آ گئے۔ مرزا

طاہر نے ابا جی کو بتایا "میں صبح صبح اپنی زمینوں پر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر میں نے سوچا کہ آج صوفی صاحب کے ہاں ناشتہ کیا جائے"۔

ابا جی مسکرائے اور کہا "جناب جتنا دل چاہے ناشتہ کریں"۔ کافی دیر تک مرزا طاہر نے اپنی زمینوں اور زراعت سے متعلق باتیں کیں پھر ابا جی نے پوچھا "جی صاحب! فرمائیں ناشتہ میں کیا چلے گا؟"

مرزا طاہر نے کہا "آج تو پراٹھے اور خربوزے کا ناشتہ کریں گے اور اگر ساتھ سرکہ ہو جائے تو کیا ہی بات ہے"۔

ان دنوں پیاز پر سرکہ ڈال کر کھانے کا بہت رواج تھا۔ سب چیزیں گھر میں موجود تھیں۔ مرزا طاہر نے ناشتہ کیا کافی دیر تک نشست جمائی اور چلے گئے۔ یہ تھی مرزا طاہر سے میری پہلی ملاقات۔

مرزائیوں کی تنظیم مجلس خدام احمدیہ درحقیقت جماعت کی ایک ایسی فوج ہے جس سے ہر جائز و ناجائز کام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں بہت سے جرائم کے بادشاہ ہیں اور اس فوج کے کمانڈر مرزا طاہر تھے۔ یہ صبح اپنا کلینک بھگتا کر خدام الاحمدیہ کے دفتر میں آ جاتے اور پھر وہاں مرزائیت کی گھناؤنی سرگرمیوں کے لئے سکیمیں تیار کی جاتی تھیں۔

مرزا طاہر کے کلینک پر مرد و زن دونوں ہوا کرتے تھے ۔ لیکن صنف نازک کی تعداد زیادہ ہوتی۔ خواتین کہتی تھیں "میاں تاری تو باتوں سے مرض دور کر دیتے ہیں"۔ ایک بار موصوف نے ایک خاتون نور احمد عابد کی بیوی رشیدہ بیگم کو کہہ دیا "آپ کی جوانی تو برسوں قائم رہنے والی ہے" جس پر موصوفہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دنوں تک مرزا طاہر کے تاثرات اپنی سہیلیوں کو بتاتی پھری۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ جب یہ بات کسی کو بتاتی تو ساتھ ہی شرم سے گلنار ہو جاتی تھی۔ مرزا طاہر کی نیلی شیشیوں میں سفید دانے دار گولیوں میں کوئی شفا تھی یا نہیں تھی، مگر اس کی "زبان اور ہاتھ" خواتین کے لئے بڑے شافی تھے۔

مرزا محمود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تخریب کارانہ ذہن کے مالک تھے۔

جماعت میں سے کہیں سے کوئی تنقید یا فتنہ سرا اٹھاتا تو وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ اسے دبا دیا کرتے تھے۔ اس کے لئے اعلیٰ درجے کے مخبر رکھے جاتے جو اول تو فتنہ اٹھنے ہی نہ دیتے اور کہیں کوئی "ابنارمیلٹی" نظر آتی ان کے کارندے وہاں پہنچتے اور صورت حال پر قابو پا لیا کرتے تھے۔ مرزا محمود احمد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری بھی مرزا طاہر نے اپنے سر لے لی۔ آل نبوت کے کالے کرتوتوں پر اگر کسی شخص نے انگشت نمائی کرنے کی کوشش کی تو مرزا طاہر نے اس کی گردن وہیں مار دی۔ ربوہ میں "گردن مارنا اور جان مار دینا" کے الفاظ محاورہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ جملے خاندان نبوت کے سپوت زیادہ تر استعمال کرتے تھے۔ مرزا طاہر کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی علامت اور روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ اپنی انہی خوبیوں اور سازشوں کی بنا پر انہیں "مسند خلافت" حاصل ہوئی۔

مرزا طاہر کا ایک ڈرائیور ولی محمد اباجی کا بہت معتقد تھا اور انہیں چاچا جی کہتا تھا۔ اس شخص کو مرزا طاہر کی اصلیت کا علم تھا۔ لہٰذا وہ اکثر ہمیں ان کی منافقت کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اسے اباجی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں تو پھر تم کفر کی یہ زندگی چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ولی محمد مسکرا کر کہتا "چاچا جی انشاء اللہ مرنے سے پہلے مرزائیت ضرور چھوڑ دوں گا"۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا اس شخص نے جونہی مرزائیت سے توبہ کی' اور حلقہ بگوش اسلام ہوا' چند روز بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

مرزا طاہر نے تخریب کاری' غنڈہ گردی اور دہشت سے "جماعت مرزائیہ" کی جو خدمات انجام دیں' وہ قادیانیوں کے لئے بجا طور پر قابل فخر ہیں لیکن مرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لئے جو معجزانہ اسباب پیدا ہوئے' وہ بھی قدرت نے مرزا طاہر کی دہشت پسندانہ ذہنیت سے ہی تیار کروائے۔

۱۹۷۴ء میں نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ پر مرزائیوں کا حملہ درحقیقت قدرت کی طرف سے مرزائیت کو نابود کرنے کی پیش قدمی تھی۔ اس آپریشن کا ماسٹر مائنڈ مرزا

طاہر تھے۔ لیکن ان کے تمام منصوبے اور تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں۔ نشتر میڈیکل کے طلبہ بالکل بے قصور تھے مگر مرزائی جماعت نے ان کو سزا دینے کے لئے اپنے جوروستم کی انتہا کر دی۔ تفریحی ٹورز اور سیاحتی دوروں پر جانے والے طلبہ شرارتیں اور "شغل میلہ" تو کرتے ہی ہیں۔ ربوہ کے اسٹیشن پر بھی طلباء نے شوروغل مچایا جو مرزائیوں کو ناگوار گزرا۔ گروپ میں شریک چنیوٹ کے زرگر کے مرزائی بیٹے ڈاکٹر ابرار نے اپنے ساتھیوں سے غداری کی اور ربوہ کے مرکز کو نشتر کالج کے طلباء کی واپسی کے پروگرام سے آگاہ کیا جس کی بنا پر طلبہ کے خلاف "آپریشن" کا منصوبہ تشکیل دیا گیا۔

ان دنوں سرگودھا سے ربوہ تک تمام سٹیشنوں پر تقریباً" مرزائی سٹیشن ماسٹر تعینات تھے۔ ان کو خصوصی ہدایات دی گئیں کہ طلبہ کی گاڑی جونہی ان کے سٹیشنوں پر رکے تو اس کے قیام کا دورانیہ بڑھا دیا جائے۔ تاکہ مرزائی غنڈے اطمینان سے طلبہ والے ڈبے سے ملحقہ بوگیوں میں سوار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ دوسری طرف اس روز یعنی ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو تعلیم الاسلام کالج میں فرسٹ ایئر اور فورتھ ایئر کا رزلٹ آؤٹ ہونے والا تھا۔ اس کے بارے میں خاص منصوبہ بندی کی گئی تاکہ "آپریشن" کے دوران طلبہ سٹیشن کی طرف نہ آئیں۔ دنیا جانتی ہے کہ کالجز میں طریقہ کار کے مطابق فرسٹ ایئر اور تھرڈ ایئر کے سالانہ امتحان کے نتائج نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیے جاتے ہیں۔ طلبہ کو خود ہی اپنے فیل پاس ہونے کا پتہ چل جاتا ہے لیکن اس روز سب طلبہ کو کیمسٹری تھیٹر میں اکٹھا کیا گیا اور رزلٹ اس طرح سنایا گیا جیسے عموماً" پرائمری سکولوں میں بول کر سنایا جاتا ہے۔ میں بھی تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ رزلٹ کے اعلان سے قبل اساتذہ نے مختلف موضوعات پر تقاریر کیں اور پھر رزلٹ سنایا گیا۔ اس سارے کام پر دو تین گھنٹے صرف ہوئے۔ اس دوران سٹیشن پر مرزا طاہر کا آپریشن مکمل ہو گیا۔

لوگ بتاتے ہیں ٹرین سرگودھا سے چلی تو مختلف سٹیشنوں سے حسب پروگرام مرزائی غنڈے چناب ایکسپریس میں سوار ہوتے گئے اور جب ٹرین ربوہ پہنچی تو مرزائی

غنڈوں نے طلبہ کے ڈبے کو گھیرے میں لے لیا اور کمپارٹمنٹ میں داخل ہو کر انہیں پلیٹ فارم پر لا پھینکا۔ ربوہ کے اسٹیشن ماسٹر مرزا عبدالسمیع نے سٹیشن پر گاڑی کو زیادہ سے زیادہ دیر روکے رکھا اور مرزائی غنڈے مرزا طاہر کی سرکردگی میں کام انجام دیتے رہے۔

نشتر کالج کے طلبہ پر جو تشدد کیا گیا' اس کی تفصیلات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ربوہ کے ریلوے اسٹیشن کے کراسنگ پل پر "حوریں" اپنے "شیر جوانوں" کی ہمت بندھانے اور نہتے طلبہ کو انجام تک پہنچانے کے لئے "رزمیہ شاعری" کرتی رہیں۔

طلبہ کو ادھ موا کر کے گاڑی روانہ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس روز مرزائیوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ انہوں نے ربوہ میں مسلمان طلبہ کو بدتمیزی کی سزا دے دی۔ ہم لوگ کالج سے نکلے تو سب سے پہلے مجھے میرے ایک کلاس فیلو عبدالحیٔ طاہر نے اس قصے سے آگاہ کیا اور کہا کہ آج نشتر کالج کے غیر احمدی طلبہ کا حساب چکا دیا گیا ہے۔

ربوہ شہر میں ایک جشن کا سماں تھا لیکن شام ہوتے ہی ساری خوشیوں کی بھی شام ہو گئی۔ پورے ملک میں اس واقعہ سے غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے روز ہنگاموں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جو مرزائیوں کو کافر قرار دینے پر ختم ہوا۔ مسلمانوں نے مرزائیوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ ربوہ میں ٹرین اور بسیں رکنا بند ہو گئیں۔ سبزی' گوشت اور اشیائے صرف کی ترسیل رک گئی اور ربوہ ملک بھر سے کٹ کر رہ گیا۔ انتظامیہ نے اس واقعہ کو محض طلبہ کا جھگڑا قرار دے کر معاملہ دبا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اس وقت کے جھنگ کے ایس۔ پی ملک یارن خان نے تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل چودھری محمد علی سے مل کر کہا کہ ہوسٹل کے دو تین سو لڑکے گرفتار کروا دیئے جائیں تاکہ وقتی طور پر ملک بھر کے ہنگاموں کو سرد کیا جا سکے۔ لیکن قدرت نے مرزائیوں کو انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ چودھری محمد علی

سے سنگین سیاسی غلطی ہوئی اور انہوں نے ہوسٹل کے طلبا کو گرفتار کرانے سے انکار کر دیا۔ ملک بھر میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے زور شور سے ہو رہے تھے۔ انتظامیہ مرزائیوں کی گرفتاریوں کو یقینی بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جب ہوسٹل سے کوئی لڑکا نہ ملا تو ملک یارن خان نے ربوہ کے شہریوں اور دکانداروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں بھی قدرت کا کمال ملاحظہ ہو پولیس نے جن افراد کو گرفتار کیا' درحقیقت وہی سانحہ ربوہ کے مجرم تھے۔ پرنسپل کی اس روش پر مرزا طاہر اور مرزا ناصر بہت سیخ پا ہوئے مگر اب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ وہ پرنسپل کو ملازمت سے برطرف بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ۷۲ء میں تعلیمی ادارے قومیائے جانے کے بعد موصوف سرکاری ملازم تھے۔ بہرحال چودھری محمد علی کی مرکز کی طرف سے کافی کلاس ہوئی۔

بعد ازاں اس واقعہ کی تحقیق جسٹس کے ایم۔ صمدانی کی سربراہی میں تشکیل دیے گئے ایک کمیشن نے کی۔ مرزا ناصر کو قومی اسمبلی میں علماء کے روبرو پیش کیا گیا۔ علماء کی بحثوں نے مرزا ناصر کے چھکے چھڑا دیئے۔ وہ پسینے سے شرابور ہو جاتے اور ایک ہی نشست میں سات سات گلاس پانی پی جاتے اور ساتھ اپنے دادا کو کوستے کہ اس کی کرنی انہیں بھرنی پڑ گئی ہے۔ علماء کی شبینہ روز کوششوں اور دلائل و براہین نے قومی اسمبلی کو اس بات پر قائل کر لیا کہ مرزائی کافر اور مرتد ہیں لہٰذا انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو تاریخی فیصلہ ہوا جس کی بنا پر مرزائی کافر قرار دے دیے گئے۔ ربوہ کے مرزائیوں کی اکثریت مرزا طاہر کے اس سیاہ کارنامے کی بنا پر اسے کوستی کہ نہ وہ نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ پر حملہ کرواتے نہ انہیں یہ دن دیکھنا پڑتے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اس کی گمراہی کی سزا دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اسی میں بعض لوگوں سے کام لیتا ہے اور قوم قعر مذلت میں غرق ہو جاتی ہے۔ لیکن مرزا طاہر کی غنڈہ لابی نے لوگوں کے منفی اذہان کو کچھ مدت میں پھر اپنے موافق کر لیا۔ درحقیقت جعلی خاندان نبوت کے پاس اپنے جد امجد کی طرح بے

شمار جھوٹے دلائل ہوتے ہیں جن کے استعمال سے وہ مطلب براری کر لیتے ہیں۔

مذکورہ واقعے پر مرزا لقمان اور مرزا طاہر کے درمیان بھی گہری ٹھن گئی تھی لیکن مرزا طاہر نے انتہائی شاطرانہ پالیسی اختیار کر کے مرزا لقمان کا غصہ سرد کر لیا اور اس کو اپنی بیٹی دے کر جملہ ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ پھر سسر داماد مل کر سیاہ کاریوں کو فروغ دینے میں مشغول ہو گئے۔

جب مرزا ناصر نے ایک "نوخیز" لڑکی سے شادی رچا کر عمر رفتہ کو صدا دی تو انہیں جہنم سے بلاوا آ گیا اور خلافت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو خلافت کے لئے صرف خاندان نبوت میں نامزدگیاں اور میچ پڑا کرتے تھے۔ اس بار جماعت کے دیگر لوگوں میں شعور خلافت عود کر آیا اور شہری حلقوں میں سے کئی امیدوار میچ کھیلنے آ گئے۔ ان امیدواروں میں صوفی بشارت الرحمٰن قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کا موقف تھا کہ مرزائیت کے لئے خدمات اگر خلافت کا پیمانہ ہیں تو ہماری خدمات کسی بھی طالع آزما سے زیادہ ہیں مگر مرزا طاہر کی لابی بہت تگڑی تھی۔ چنانچہ خلافت کی گیند خود بخود مرزا طاہر کی کورٹ میں جا پہنچی اور یوں صوفی بشارت الرحمٰن ہاتھ ملتے رہ گئے۔

خلیفہ بننے کے بعد بھی مرزا طاہر نے خوب پر پرزے نکالے۔ مرزائیت کو اقلیت قرار دیے جانے والے سرکاری فیصلوں سے ٹکرانے کے لئے حکمت عملیاں تیار کی گئیں۔ ایک بار مرزا طاہر نے مسلمان علماء کو مناظرے کا چیلنج کر دیا۔ لیکن علمائے کرام نے اس کو دندان شکن جواب دیتے ہوئے کہا "اے بد بخت زمانہ! مناظرہ تو مسلمان علماء کا مسالک پر ہوتا ہے تمہارے ساتھ تو مباہلہ ہو سکتا ہے اور نکلو میدان میں مباہلہ کرو"۔ مگر یہ شخص جھوٹا تھا اپنے "دادا" کی طرح گھر میں دبک کر بیٹھ گیا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو مرزا طاہر کی تخریبی ذہنیت نے مسلمان علماء پر حملے کرانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور وہ بعد ازاں ایک رات لندن فرار ہو گیا۔

اب مرزا طاہر احمد سیٹلائٹ پر ساری دنیا کے مرزائیوں سے خطاب کرتے ہیں لیکن یہ بات نوشتہ دیوار بن چکی ہے کہ مرزا طاہر اب کبھی ربوہ واپس نہیں آ سکیں گے

بلکہ لندن سے سیدھا جہنم جائیں گے۔ پاکستانی علماء کے خلاف زہر اگلنے والا یہ شخص سیٹلائٹ پر لاکھ خطاب کرے مگر اب انہیں ربوہ میں خطاب کرنے کا کبھی موقع نہیں ملے گا۔

مجھے میرے ایک جاننے والے نے ایک روز کہا "چلیں آپ کو ماڈل ٹاؤن لے چلیں" میں نے پوچھا "کیوں" کہنے لگا "آج حضرت مرزا طاہر ڈش پر جماعت سے خطاب کر رہے ہیں۔ آپ کو وہ سنوائیں گے"۔ میں نے کہا "انہیں ہمیں کچھ سنانے کی جرات ہوتی تو وہ یہاں سے بھاگ کر لندن کیوں جاتے۔ ہم کسی بھی بھگوڑے اور خود پر خود ساختہ جلا وطنی کا لیبل لگانے والے جھوٹے شخص کی تقریر نہیں سنتے"۔ اس پر مذکورہ صاحب کا "لمبا" سا منہ مزید لٹک گیا۔

طلسمی صندوق

میرے ذہن میں یہ سوال اکثر گردش کیا کرتا تھا کہ مرزائی قوم اتنی دولت مند کیوں ہے۔ اس کے خاندان نبوت کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی حالانکہ مال و زر اہل نبوت کا خاصہ نہیں ہوتی۔ اس سوال کا جواب مجھے میرے کلاس فیلو عبدالسلام عبی نے نہایت مفصل اور مدلل طریقے سے دیا۔ عبی نہایت بے ضرر' کھرا اور مرزائی بے زار شخص تھا۔ اس کے والد ماسٹر یوسف پرائمری سکول کے ٹیچر تھے۔ بقول "اس کے" اسے احمدیت سے شدید نفرت تھی۔ لیکن والدین کی وجہ سے اس طوق کو گلے لگا رکھا تھا۔ اس کی بیزاری قدرت کو شاید اس قدر پسند تھی کہ "بیچارہ عبی" ابھی جوانی کی دہلیز پر ہی تھا کہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ شخص مجھے مرزائیوں کے اسرار سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ بہت سے سمجھ نہ آنے والے مرزائیت کے عقدے کھولنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مرزائیوں کی اقتصادی خوشحالی کے بارے میں استفسار کرنے پر عبی نے بتایا کہ کسی بھی مذہبی جماعت' سماجی اور سیاسی تنظیم کی کامیابی ٹھوس مالی بنیاد کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ مرزائی نبی اس کے خلفاء اور امت کے "بڑوں" نے دولت سمیٹنے کے لئے مختلف نظاموں اور پروگراموں پر مبنی ایک نیٹ ورک بنا رکھا ہے جس کے تحت وہ اپنی جماعت کے مظلوموں اور معصوموں کی جیبیں قتل بھی کرتے مگر چرچا نہیں ہوتا۔ تاہم سب مرزائیوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ان کے کاشانہ نبوت میں دولت کے انبار کن کن کھیتوں اور کھلیانوں سے آتے ہیں۔

مرزا غلام احمد کسی زمانے میں سیالکوٹ میں رجسٹری محرر تھے انہیں زمین ہتھیانے اور اپنے نام لگانے کے جملہ گر آتے تھے پھر انگریز سے انہوں نے خلعتِ نبوت بھی تو محض مال و زر کے لئے حاصل کی تھی۔ "مرزا غلام احمد" نے قادیان کی

ساری زمین لمبی مدت کے لئے پٹے پر حاصل کر لی اور پھر وہ زمین رہائشی پلاٹوں کی شکل میں اپنے ہی پیروکاروں میں فروخت کر کے قیمت حاصل کر لی۔ مگر زمین کے انتقال مرزائی خریداروں کے نام نہ کرائے گئے۔ یوں وہ رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے دی۔ دولت تو مرزا قادیانی کے گھر کی لونڈی اسی وقت بن گئی تھی جب انہوں نے انگریز کے کہنے پر کاشانہ رسالت میں نقب لگائی اور جھوٹے نبی بن بیٹھے۔ "مرزا غلام احمد" کے مرنے کے بعد یہ ساری دولت اور زمینیں نصرت جہاں کی اولاد کو مل گئیں جبکہ "ہجا اور اس کی ماں نامراد ہی رہے"۔ مرزا محمود احمد اپنے باپ کے بھی باپ نکلے ۔ جھوٹ' عیاری' عیاشی اور مکاری میں باپ کو بھی مات کر دیا۔ باپ مسیح موعود تھا تو بیٹا مصلح موعود۔ باپ نبی تھا تو بیٹا خلیفہ۔ باپ لٹیرا تھا تو بیٹا راہزن تھا۔ بہرکیف قیام پاکستان کے بعد مرزائی نبی کی آل اور مرزائی امت جب با دل نخواستہ قادیان سے ربوہ آئے تو یہاں مرزا محمود نے باپ والی چال چلی۔ پہلے تو اس نے قادیان کی جملہ زمینوں کے بدلے سندھ میں سونا اگلتی زمینیں کلیم کرا لیں اور ان کو مختلف دیہات بنا کر اپنے بیٹوں کے نام لگا دیا۔ عبی کے بقول سندھ میں ناصر آباد' منصور آباد' مبارک آباد سمیت کئی ریلوے سٹیشن مرزائیوں کے نبی زادوں کے نام ہیں۔ ان زمینوں سے اگلنے والا سونا بھی مرزائی آل نبوت کی تجوریوں کو ہی بھرتا ہے۔

اس کے علاوہ مرزا محمود احمد نے ربوہ جس کا اصل نام "چک ڈ مگیاں" ہے یہاں ۹۹ سال کے لئے غالباً" ۱۰۳۴ ایکڑ زمین ایک آنہ فی مرلہ کے حساب سے حاصل کر لی۔ یہ زمین بھی مرزائی امت کو فروخت کر کے اپنے "مالی گھڑے" بھر لئے گئے۔ مکان خریدنے کے باوجود زمین کا انتقال کبھی بھی خریدار کے نام نہیں کرایا گیا۔ یوں مرزا محمود احمد نے اپنی امت سے دھوکہ دہی کی بنا پر کروڑوں روپیہ کما لیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مرزائی خواہ کتنا ہی اس مذہب سے بے زار کیوں نہ ہو وہ صرف مکان کی خاطر ربوہ چھوڑنے کی جسارت نہیں کرتا۔

ربوہ میں مختلف ادارے بھی ہیں جو خود ساختہ قوانین کے سہارے چل کر اپنی

امت سے پیسے بٹورنے کے لئے حیلہ جوئی کرتے ہیں۔ ان اداروں اور دفاتر میں امور عامہ، تحریک جدید، فضل عمر فاؤنڈیشن، فضل عمر ہسپتال اور مجلس خدام احمدیہ شامل ہیں۔ یہ سب سونے کی مرغیاں ہیں جو مسلسل سونے کا انڈہ دے کر جماعت کے "بڑوں" کے خزانے بھرتی رہتی ہیں۔

عبدالسلام عبی نے صرف فضل عمر ہسپتال کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ہسپتال درحقیقت ایک خیراتی ہسپتال ہے جس کی تعمیر لوگوں کے عطیات سے ہوئی ہے۔ ہسپتال کے ہر کمرے کے باہر نصب تختی یہ بتاتی ہے کہ اس کمرے کا خرچ کس نے دیا ہے۔ یہاں ادویہ لوگوں کے صدقات و خیرات سے آتی ہیں۔ انتہائی قیمتی آلات جماعت کے خون پسینے کی کمائی سے لائے گئے ہیں لیکن علاج کی سہولیات و مراعات صرف "بالا بلندوں اور منہ لگے" لوگوں کو حاصل ہیں۔ جہاں تک غرباء کا تعلق ہے انہیں دوا ملے نہ ملے لیکن دھکے ضرور ملتے ہیں۔ ہسپتال کی باگ ڈور "مرزا منور" کے ہاتھ میں ہے جن کی رسائی ہے ان کے وارے نیارے، نہیں تو جہنم میں گئے سارے"۔

"دیگر دفاتر میں بظاہر جماعت کے بے شمار لوگوں کو ملازمتیں حاصل ہیں لیکن حقیقت دیکھی جائے تو ہر شخص اک عذاب سے دوچار ہے جو جماعت کے لئے کام کرکے قلیل معاوضہ لیتا ہے لیکن اس میں سے بھی ایک حصہ جماعت والوں کو دے دیتا ہے"۔ یہ بات تو میرے اپنے مشاہدے میں بھی آئی ہے کہ ہمارے ایک دوست کا بھائی تحریک جدید میں ملازم تھا۔ اس کی آمدن اس قدر قلیل تھی کہ اس کی بیوی دور افتادہ ایک گاؤں میں ملازمت کر کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔ حالانکہ جس دور کی یہ باتیں ہیں خواتین کی ملازمت کا رواج بھی نہیں تھا۔

ٹاؤن کمیٹی ربوہ جس کی چونگیوں کے ٹھیکے اور دیگر معاملات پر بھی مرزائی جماعت کی اپنی گرفت تھی۔ مرزا انور اس کا کرتا دھرتا تھا اور مال کما رہا تھا۔ شہر کے گرد پھیلی ہوئی پہاڑوں کی وسیع و عریض چادر کے تمام ٹھیکے مرزا ناصر کے بھائی مرزا رفیق کے پاس تھے اس نے ان کو "سب لیٹ" کر رکھا تھا۔ لڑکے لڑکیوں کے سکول و کالج بھی

دولت کے دریا تھے۔ یہاں طلبہ سے تو سرکاری نرخوں کے مطابق فیس لی جاتی تھی جبکہ اساتذہ کو بہت کم تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ جب تعلیمی ادارے قومیائے گئے تھے تو ان اداروں کے اساتذہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

چندے جن کی کئی اقسام تھیں' وہ بھی مرزائی خاندان نبوت پر "ہن" برساتے اور اس "شجر" ممنوعہ کو شاداب رکھتے تھے۔ اطفال کا چندہ بچوں سے ناصرات کا چندہ لڑکیوں سے' خدام کا چندہ نوجوانوں سے لجنہ اماء اللہ کا چندہ خواتین سے اور انصار اللہ کا چندہ بوڑھوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ چندہ وصیت سمیت کئی چندے کالے قوانین کی طرح اس امت پر مسلط تھے اور انہیں گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔

جامعہ احمدیہ مرزائیوں کی "مبلغ ساز" فیکٹری تھی جس میں مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے تبلیغ کرنے والا خام مال تیار ہوتا تھا۔ جماعت کی خدمت کا جذبہ لے کر یہاں آنے والے مبلغ اپنی زندگی اور زر ادارے کی نذر کرتے اور اسے بخشش کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کی خام خیالی ہے جلد ہی انہیں اصل حالات سے آگاہی ہو جاتی ہے مگر وہ اس کمبل کو چھوڑ سکتے ہیں نہ ریچھ انہیں چھوڑتا ہے۔

جماعت کے تمام افراد جن کا کسی نہ کسی حوالے سے کوئی ذاتی کاروبار ہے انہیں بھی آمدنی کا ایک حصہ بلا کسی حیل و حجت کے مرکز کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ بے شمار دکاندار' زمیندار' صنعت کار' فیکٹری مالک' ٹرانسپورٹر اور حکماء ڈاکٹر اپنی دولت پر لگے ہوئے مرزائیت کے **جگے** ٹیکس بڑی باقاعدگی سے جماعت کو دیا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد اور ان کی آل اولاد نے جماعت کو چندہ کی اہمیت اور افادیت سے اس قدر ہپناٹائز کر رکھا ہے کہ وہ چلتے پھرتے آتے جاتے سوتے جاگتے چندے کی ادائیگی کو ایک مسنون فعل قرار دیا کرتے ہیں۔ "چندا اڈکشن" کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ ایک مرزائی کو مسلمانوں نے قائل کر لیا کہ "مرزا جھوٹا" نبی ہے لہٰذا اسے ماننا خدا اور اس کے رسول کے احکام سے انکار کے مترادف ہے۔ قریب تھا کہ یہ شخص مسلمان ہو جاتا مگر اس نے محض اس وجہ سے اسلام قبول نہیں کیا کہ وہ مرزائیت چھوڑ کر چندہ کسے دے گا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ مرزا ناصر قصر خلافت میں جس جگہ عام لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں وہاں ایک بڑا صندوق رکھا ہے۔ اسے یار لوگ "طلسمی صندوق" کہا کرتے تھے۔ ہفتے میں دو روز مرزا ناصر سے عام ملاقات ہوتی تھی۔ جس کے لئے پہلے سے وقت لیا جاتا تھا۔ اور بعض اوقات تو باری بھی بڑی مشکل سے آتی تھی۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملاقات کے لیے آتے تو اس صندوق کا پیٹ بھرنے کے لئے دولت، قیمتی کپڑے اور تحائف، اجناس، خوشبویات اور دیگر عطیات جھولیاں بھر کر لاتے تھے۔ جب مجھے اپنے ابا جی کے ہمراہ قصر خلافت جانے کا موقع ملا تو میں نے وہ صندوق دیکھا جسے صدمے سہہ کر صدقات دینے والے بھرتے تھے۔ لوگ آتے صرف "السلام علیکم" کہتے، دعا کی درخواست کرتے اور روپے، زیور، بانڈز اور اپنی متاع گراں اس صندوق میں ڈال کر چلے جاتے۔ اس صندوق کی ساری آمدن صرف اور صرف "مرزا ناصر احمد" کی ہوا کرتی تھی۔ یہ سب تو آمدن کے جائز اور ظاہری ذرائع تھے جن سے مرزائیت پھل پھول رہی تھی۔ اس کے علاوہ بے شمار ناجائز ذرائع بھی مرزائیت کو پال پوس رہے تھے۔

یہود و ہنود اور عیسائی اقوام مسلمانوں کی جس قدر دشمن ہیں، اس حقیقت سے انکار اور فرار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اسلام میں دراڑیں ڈالنے اور مسلمانوں کو ان کی مقصدیت سے دور کرنے کے لئے "مرزا غلام احمد" کو نبی بنایا۔ انگریز نے اپنے خود کاشتہ پودے کو تناور درخت بنانے اور زندگی بھر ہرا بھرا رکھنے کے لئے ہمیشہ آب زر سے اس کی آبیاری کی۔ اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے آج بھی اسرائیل اسے دولت کی کھاد فراہم کرتا ہے۔ بہت سے غریب اور بے زار مرزائی تب بھی اور آج بھی اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ مرزائیت عالمی قوتوں کی مضبوط کردہ جماعت ہے۔ ورنہ اس کی ذاتی، مذہبی اور سماجی طور پر کوئی حیثیت نہیں۔ ایک مرزائی کلاس فیلو نے مجھے ایک بار بتایا کہ اگر سارے احمدی ہمت کر کے جماعت کو چندے دینا بند کر دیں جو "جگا ٹیکس" کے طور پر وصول کیے جاتے ہیں، مرزائی جماعت کی سانس بند ہو جائے۔

چندوں کی آکسیجن نے ہی درحقیقت اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں۔ مرزائی نبی اور خلفاء نے یہ نظام اس مضبوطی سے چلایا ہے کہ اس کو توڑنا خاصا مشکل کام ہے لیکن وقت کی ضربیں خود بخود اسے کمزور کر رہی ہیں۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ربوہ میں چندہ دینے والے غریب' وصول کرنے والے درماندہ و پسماندہ جب کہ چندہ جن کے لئے لیا جاتا ہے' وہ مضبوط اہل ثروت اور حکمران ہیں۔ ستم ظریفی کا یہ عالم ہے کہ اپنے ہی دیے چندوں میں سے مرزائی مستحقین کو جب صدقات و خیرات ملتے ہیں تو وہ قسمت کے مارے اس بات پر نازاں ہوتے ہیں کہ ان کا "خاندان نبوت" ان کی مالی امداد کر رہا ہے۔

کوتوال شہر

"پتا پہ پوت اور نسل پر گھوڑا بہت نہیں تو ضرور تھوڑا" والی مثال کے مطابق مرزا ناصر کا بیٹا لقمان اپنے باپ بلکہ دادا مرزا محمود احمد کے خصائل کا مکمل پرتو تھا۔ چھٹی جماعت میں یہ ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ مسلمان کیا اپنے جیسے مرزائیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اور اگر بھولے سے کسی امتی کے ساتھ ہاتھ ملا لیتا تو وہ مرزائی اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوتے ہوئے گھنٹوں کبھی خود کو کبھی اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہتا تھا۔ ایک بدمعاش بچپن میں جو "کچھ" ہوتا ہے مرزا لقمان ان حقائق کا عین عکاس تھا۔ فرعونی خصوصیات' یزیدی اوصاف مرزا لقمان کی شخصیت کا جزو لاینفک تھے۔ کتے پالنا' گھوڑے رکھنا' چادر اور چار دیواری کے تقدس کو پامال کر کے اپنی جنسیت کی تسکین کرنا اس شخص کی زندگی کے لوازم تھے۔ شرفا کی لاج کو مرزا لقمان نے لچوں کا قہقہہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

جن لوگوں نے مرزا محمود احمد کی جوانی دیکھی ' ان کا کہنا تھا کہ مرزا لقمان کے سارے چلن اپنے دادا جیسے تھے جس طرح موصوف اپنی تخریبی چالوں سے فتوحات حاصل کرنے کے خوگر تھے اسی طرح لقمان بھی تخریبی کارروائی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ طالب علم رہنما رفیق باجوہ نے مرزائیت کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تو مرزا لقمان نے اس کو ختم کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ اس کی تلاش میں رفیق باجوہ کے باپردہ گھرانے میں داخل ہو کر چادر اور چاردیواری کے تقدس کی دھجیاں اڑا دیں۔

مرزا محمود احمد کی طرح مرزا لقمان بھی امت کی جس حور شمائل کو چاہتا ' قصر خلافت بلا لیتا اور اپنے دادا کی "سنت" ادا کر لیتا تھا۔ شہر کے غنڈوں کی ایک فوج مرزا لقمان کے اشارے پر ہر جرم کرنے پر آمادہ رہتی تھی اور اس بے مہار فوج کا یہ سپہ

سالار کرائے کے بازوؤں سے اپنے مقاصد حاصل کر لیا کرتا تھا۔

مرزا ناصر بھی اپنے اس سپوت سے ڈرتے تھے۔ مرزا لقمان کے بڑے بھائی مرزا فرید نے ایک مرزائی خاندان کی لڑکی اغواء کر لی تو مرزا ناصر نے امت اور لڑکی کے والدین کی اشک شوئی کے لئے مرزا فرید کو ربوہ بدر کر دیا جبکہ مرزا لقمان ایسے کئی کارنامے انجام دینے کے باوجود ہر گرفت سے بالا تھا۔

ربوہ میں بد معاشوں اور قبضہ گروپ کے کئی دھڑے تھے۔ جن کی پشت پناہی مرزا انور چیئرمین ٹاؤن کمیٹی اور مرزا طاہر کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے مرزا لقمان نے جوانی میں قدم رکھا ہر بدمعاش اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ جماعت اور جھوٹی نبوت کے خاندان کے قواعد و احکام سے سرتابی کرنے والوں کے لئے عقوبت خانے اور ٹارچر سیلز قائم تھے جن کی سربراہی بھی مرزا لقمان ہی کیا کرتا تھا۔

شہر میں نوجوانوں کی مختلف ٹولیاں رات کو پہرہ دیا کرتی تھیں۔ ان کی تشکیل بھی مرزا لقمان کے دائرہ اختیار میں تھی۔ انہی گروہوں سے کئی افراد چوری کی وارداتوں میں ملوث ہوا کرتے تھے۔ ایسے تمام چور بھی خلیفہ زادے کے پروردہ تھے۔ ربوہ والے اپنے ساتھ ہونے والے کسی ظلم و زیادتی کی اطلاع پولیس کو نہیں کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مرزائی مرکز کی خود ساختہ امور عامہ سے داد رسی حاصل کر لی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص پولیس کے پاس جانے کی کوشش کرتا تو اسے نہ صرف مرکز کے انصاف بلکہ جماعت سے بھی محروم ہونا پڑتا تھا۔ مرزا لقمان ربوہ کے نام نہاد نظام انصاف کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔

چودہ سو سال قبل عرب کا معاشرہ جس اخلاقی انحطاط کا شکار تھا' اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے خالق کائنات نے حضرت نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرما کر معاشرے میں انقلاب برپا کر کے رکھ دیا لیکن قادیان کے جھوٹے پیغمبر کے دعویٰ نبوت کے بعد اخلاقی لحاظ سے ایک ایسے پست معاشرے نے جنم لیا جس کی اصلاح عبث ہو چکی ہے۔ مرزائی خلیفہ وقت کی دو رخی پالیسی کا یہ عالم تھا کہ اغوا کے کیس میں ملوث مرزا فرید کو شہر بدر

تو کر دیا گیا مگر اسے یہ سہولت بھی دے دی گئی کہ وہ جب چاہے ربوہ آ سکتا تھا۔ جس خاندان کی لڑکی اغوا ہوئی تھی' وہ مرزا فرید کو ربوہ میں دیکھتا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا مگر مرزا لقمان کے خوف سے ان میں دم مارنے کی بھی مجال نہیں تھی۔

ربوہ میں "تقدے ' چھدے ' جگے' بشیر بلے' مقصودے پٹھان اور لطیف ننھے" جیسے ناموں سے موسوم بدمعاشوں کے کئی دھڑے تھے۔ ان گروپوں کی آپس میں لڑائی اور پھر ان میں فیصلہ کر کے اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لئے مرزائی خاندان نبوت نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا اصول بنا رکھا تھا۔ ابتدائی صفحات میں ایک پٹھان کا ذکر کیا گیا ہے مذکورہ بدمعاشوں کے گروہوں میں مقصودا پٹھان گروپ کا مقصود خان اور اسی کا بیٹا تھا جب کہ اس کے دیگر دو بھائی رفیقا پٹھان اور فاروقا پٹھان بھی اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر وقت اپنے خلیفہ زادے کے حکم کے غلام رہتے تھے۔

مقصود پٹھان وغیرہ بے شک مرزائیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے' مگر جب سے ان کے ماں باپ مرزائیت سے متنفر ہوئے' ان کے دل میں بھی جھوٹی بنوت کے دعویداروں کے خلاف گرہ پڑ گئی تھی۔ مرزا انور نے ایک بار مقصودے پٹھان کو غنڈہ گردی کا کوئی معرکہ سرانجام دینے کے لئے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ایسی حکم عدولی کہاں برداشت کی جا سکتی تھی۔ بس پھر کیا تھا' مرزا لقمان' مرزا طاہر اور مرزا انور نے آپس میں سر جوڑ لیے اور مقصودے پٹھان اور اس کے بھائیوں کو سبق سکھانے اور ٹھکانے لگانے کے لئے بدمعاشوں کے کئی گروپوں کو پٹھان بھائیوں کے پیچھے لگا دیا گیا۔ ان پر کئی بار حملے کرائے گئے۔ ایک بار مرزا انور کی سرکردگی میں مقصودے کے گھر پر زبردست حملے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مقصودا پٹھان نہایت سخت گیر انسان تھا کہ ایک بار اس کے پالتو کتوں میں سے ایک نے فریج کا دروازہ کھول کر گوشت نکالا اور کھا لیا۔ اس پر مقصودے کو اتنا شدید غصہ آیا کہ اس نے کتے کو چاروں ٹانگوں سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ اس زور سے مارا کہ اس کا بھیجا نکل کو دور جا گرا۔ پھر اس کتے کو درخت سے لٹکا دیا تاکہ دوسرے کتوں کو سبق حاصل ہو اور وہ ایسی حرکت نہ کر سکیں۔

ایسے مزاج کے شخص سے کسی بھی سلوک کی توقع کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ پٹھان بھائیوں کو جب مرزائی حملے کی خبر ہوئی تو انہوں نے بھی تیاری کر لی اور گھر کے اندر سے جوابی حملہ کا پروگرام بنایا۔ مرزا لقمان' مرزا انور اور مرزا طاہر کی غنڈہ فوج شام ڈھلے پٹھانوں کے گھر کی طرف بڑھی۔ تینوں بھائی گھر سے باہر آنے لگے تو ان کی ماں نے انہیں روک دیا اور کہا کہ اس بار وہ اس جھوٹے خاندان نبوت کا مقابلہ خود کرے گی۔ جس کی مدت سے وہ پیروکار رہی اور جن پر میری وجہ سے تمہارا باپ بھی ایمان لے آیا۔ بہادر خاتون بندوق لے کر چھت پر چڑھ گئی اور اس سے پہلے کہ حملہ آور فائرنگ کرتے اس نے نشانہ لے کر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ مرزائی سالار اور ان کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ان کے دو تین افراد شدید زخمی ہوئے جنہیں حملہ آور وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اسی رات پٹھان بھائیوں کا باپ ہمارے ہاں آیا اور ابا جی سے کہا "صوفی صاحب! آج تمہارا بھابھی نے مرزائی تابوت میں کیل ٹھوکنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد اس خاندان نے ربوہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ وہ لوگ مسلمان ہو کر چارسدہ چلے گئے۔

محمد علی پھل فروش گول بازار میں پھلوں کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ یہ شخص قصر خلافت کے ان پرانے ملازموں میں سے تھا جو اندر کے بھید اور خاصے کی بات جانتے تھے۔ نہ جانے اس شخص سے کیا خطا ہوئی جس کی بنا پر اسے قصر خلافت کی خدمت سے الگ کر دیا گیا۔ محمد علی نے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے گول بازار میں ریڑھی لگا لی لیکن جھوٹے خاندان نبوت پر یہ خوف سوار رہنے لگا کہ محمد علی کہیں ان کے اندر کے راز افشا نہ کر دے۔ یہ خوف بالآخر محمد علی کے قتل پر منتج ہوا۔ اسے کسی نامعلوم شخص نے قتل کر کے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے قریب پہاڑی کے ساتھ عیسائیوں کی بستی میں پھینک گیا۔ مقتول کے لواحقین کے اصرار کے باوجود مرزائی ارباب حل و عقد نے یہ کیس پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے نام نہاد تھانیدار عزیز بھانبڑی کے

حوالے کر دیا لیکن جب دباؤ بڑھا تو مجبوراً" یہ مقدمہ پولیس کو دینا پڑا تاہم مرزائیوں نے یہ قتل عیسائیوں پر ڈال دیا۔ جب پولیس نے عیسائیوں کو پکڑا اور تھانے میں مارا پیٹا تو ربوہ بھر کے تمام خاکروبوں نے احتجاجاً" ہڑتال کر دی۔ دو تین دن کوڑا کرکٹ اٹھانے جب کوئی نہ آیا تو تعفن نے مرزائی امت اور اس کے آقاؤں کی عقل ٹھکانے لگا دی۔ انہوں نے پولیس کے حکام بالا کی مٹھی اور جیب گرم کر کے عیسائی چھڑا لیے اور یوں محمد علی کا پر اسرار قتل داخل دفتر کرا دیا گیا۔ اس قتل کے محرکات کیا تھے' اندر کے لوگ جب دبے دبے الفاظ میں سرگوشیاں کرتے تو کئی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ محمد علی قصر خلافت کے خواتین و حضرات کے بہت سے رازوں سے واقف تھا۔ ایک بار اس نے اپنے کسی ساتھی ملازم سے یہ بات کہہ دی کہ اسے جب بھی موقع ملا وہ قصر خلافت اور مرزائیت چھوڑ دے گا اور جھوٹے خاندان نبوت کی کہانیاں عام کر دے گا۔ یہ بات "مذہبی وڈیروں" کو پتہ چلی تو انہوں نے محمد علی سے اس کا روزگار' مکان اور بیوی بچے چھین لینے کی دھمکی دی جس پر اس نے جواباً" للکارا کہ وہ بھی اندر کے راز ساری امت میں پھیلا دے گا۔ بعد میں اسے قصر خلافت سے نکالتے وقت یہ سمجھوتہ ہوا کہ "خاندان" اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا جبکہ محمد علی بھی اپنی زبان بند رکھے گا۔ محمد علی نے کچھ عرصہ تو زبان بند رکھی مگر مرزائیوں کی سی آئی ڈی کو معلوم ہوا کہ محمد علی وقتاً" فوقتاً" "خاندان" والوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ربوہ میں "خاندان" کا لفظ صرف مرزا غلام احمد کے خانوادہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ مرزائی ظالموں نے محمد علی کو قتل کرا دیا۔ شہر میں اکثر واقف حال لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی ماہر کھوجی محمد علی کے قتل کا کھوج لگائے تو "کھرا" مرزا لقمان کے گھر جا نکلے۔

یہ مرزا لقمان کے قول و عمل کا اثر تھا یا مرزا غلام احمد کی تعلیم کی کرامت تھی کہ ربوہ میں عام لڑکے بھی معمولی معمولی باتوں پر اتنی لمبی لڑائیاں کرتے جو کئی کئی ہفتوں اور مہینوں پر محیط ہو جاتیں اور فریقین موقع ملتے ہی مخالف پر حملہ کر دیا کرتے تھے۔

سکول سے چھٹی کے بعد عموماً" لڑکے گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور مخالف فریق کو آتے ہی اپنی زد میں لے لیتے۔ لوہے کے "مکے اور چاقو" عام سے عام لڑکے کی جیب میں ہوا کرتے تھے۔

ہمارے ساتھ ایک لڑکا نعیم شاہ پڑھتا تھا۔ اس کی لڑائیاں اکثر چلتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ اس کے ایک دشمن نے جو اسی جیسا مرزائی تھا' اس کے سر میں چاقو مار دیا۔ اگر مرزائی لڑکے یہ لڑائیاں مسلمانوں یا کسی غیر مذہب کے لوگوں سے لڑتے تو اس کی سمجھ بھی آتی مگر ان کے لوہے کے مکے اور چاقو تو اپنے جیسے مرزائیوں پر ہی چلا کرتے تھے۔ اس صورت حال پر کئی متاثرین مرزائیوں کا یہ تبصرہ ہوتا تھا کہ مرزا طاہر' مرزا انور اور مرزا لقمان اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لئے اپنی امت کے لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے اور پٹواتے رہتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی عام لوگوں کے بچے بھی "ایڈونچرر" بننے کے شوق میں عام سطح پر محاذ کھول لیتے تھے۔ اکثر والدین کو اس وقت سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا جب ان کا بچہ سکول سے واپس آتا تو اس کا گریبان چاک اور ناک و سر لہولہان ہوتے تھے۔

ہماری کلاس میں رشید جوئیہ اور شریف شریفی دو لڑکے پڑھتے تھے۔ دونوں میں کسی بات پر لڑائی ہو گئی۔ چھٹی کے بعد راستے میں دونوں میں مادر و خواہر کی مغلظات کے تبادلے ہوئے اور شریفی نے ایک پتھر رشید جوئیہ کو دے مارا جو اس کی آنکھ کے عین اوپر لگا اور خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ ایسی باتوں کا سدباب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا کہ اگلے روز متاثرہ لڑکوں کے والدین سکول آتے' شکایت کرتے۔ اساتذہ انہیں یقین دہانی کراتے کہ آئندہ انہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ اگر بات زیادہ بڑھ جاتی تو ہیڈ ماسٹر صاحب جارح فریق یا لڑکے کو "چھ چھڑیاں" لگا دیتے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ ربوہ کے سکول میں "چھ چھڑیاں" بہت بڑی اور سنگین سزا ہوا کرتی تھی۔

مرزا لقمان کے بعد ربوہ میں اگر کسی کا راج تھا تو وہ عزیز بھانبڑی تھا۔ یہ

ہمارے سکول ٹیچر مولوی ابراہیم بھانبڑی کا بھائی اور اٹامک انرجی کمیشن کے ایک سرکردہ آفیسر منیر احمد بھانبڑی کا سسر تھا۔ عزیز بھانبڑی نہ صرف مرزا لقمان کے عقوبت خانوں اور ٹارچر سیلز کی نگرانی کرتا بلکہ اس کے اپنے بھی تشدد گھر تھے۔ جرم و خطا اور تعزیر و سزا کو جانچنے کا اس شخص کا اپنا ہی معیار تھا۔ "ستم یہ خوش کبھی لطف و کرم پر رنجیدہ" کے فلسفے کے مطابق کسی کو معمولی سی بات پر دھن کر کے رکھ دیتا اور کسی کو بڑے سے بڑے جرم پر بھی معافی دے دیتا تھا۔ لڑکوں کے سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو انہیں چھڑیوں سے مارتا' کسی کے بال بڑھے ہوتے یا قلمیں لمبی ہوتیں تو سرعام بال کاٹ دیتا تھا ــــــ اسے دیکھ کر مرزائی لڑکوں کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔ اسے مرکز کی طرف سے اچھی رہائش اور بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ کہنے والے کہتے تھے کہ یہ سب کچھ محض اس وجہ سے ہے کہ عزیز بھانبڑی "خاندان" والوں کا بھیدی ہے اور اس ڈر سے کہ کسی وقت کوئی لنکا نہ ڈھا دے' وہ لوگ اس کو ہمیشہ خوش رکھا کرتے تھے۔

واقفان حال کا کہنا ہے کہ محمد علی پھل فروش کی زبان بندی کے لئے بھی عزیز بھانبڑی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ لیکن مقتول اپنی ضد پر اڑا رہا تو اسے ٹھکانے لگانے میں بھی عزیز بھانبڑی نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ کوتوال شہر دوپہر ڈھلتے سائیکل پر سوار ہو کر پورے شہر کا گشت کیا کرتا تھا۔

مرزائی اکابرین کی "ذاتی" بہادری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ربوہ کے باغی نوجوانوں نے رابعہ انقلابی کے نام سے ایک گروہ بنایا اور رابعہ انقلابی کے نام سے مرزا ناصر کو خط لکھا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت ربوہ فتح کرنے آ رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا' خوف کی ایک لہر نے "خاندان" کے ہر مرد کو چوڑیاں پہن کر قصر خلافت میں چھپ جانے پر مجبور کر دیا۔ جبکہ "امت" کے نوجوانوں کو قصر خلافت اور شہر کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔ شہر کے داخلی راستوں پر موجود پہرے دار شہر میں داخل ہونے والے ہر شخص کی تلاشی لیتے اور کسی اجنبی کو ربوہ میں نہ آنے دیتے۔

یہ صورت حال ایک دو ماہ قائم رہی مگر مرزائی قوم اور اس کے سالار ایک بار

تو خوف سے لرز گئے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ تنویر فوٹو سٹوڈیو کے مالک احمد زمان کے ساتھ پیش آیا۔ یہ لوگ لاری اڈا کے پاس پہرہ دے رہے تھے کہ خواتین کا ایک گروپ شہر میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے حسب معمول انہیں پرسش کئے بغیر ہی شہر میں جانے دیا۔ مرکز کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو فوٹوگرافر اور اس کے ساتھیوں کو قصر خلافت طلب کر کے پوچھا گیا کہ مذکورہ خواتین کو تلاشی کے بغیر کیوں جانے دیا گیا ہے؟ تنویر نے مرزا ناصر کو بتایا کہ خواتین کو نہ روکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ "خاندان" کی عورتیں تھیں۔ اس پر سوال کیا گیا کہ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خاندان کی خواتین تھیں" تنویر نے جواب دیا "آنکھوں سے کیونکہ ایسی آنکھیں صرف خاندان والوں کی ہی ہو سکتی تھیں" اس معنی خیز جواب نے مرزا ناصر کو چپ کرا دیا۔

منافقت کے چکنے چکنے پات

یہ حقیقت ہر شخص جانتا ہے کہ ملک کی تمام کلیدی آسامیوں پر آج بھی مرزائی براجمان ہیں اور جن دنوں کے حقائق یہاں رقم ہیں تب تو ملک بھر میں مرزائی راج تھا۔ ہر محکمے کی بڑی بڑی کرسی مرزائیوں کے قبضے میں تھی۔ یہ اتفاق کی بات نہیں بلکہ مرزائی نبی اور اس کے خلفاء کی منظم منصوبہ بندی تھی کہ ملک کے اعلیٰ اداروں کی اعلیٰ آسامیوں پر ان کا قبضہ رہے۔ انہی حقائق کے پیش نظر مسلمان کیا مرزائی بھی نوکریوں کے لئے مرزائی خاندان نبوت کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے۔

ہم لوگ ربوہ آئے تو بھیرہ سے ہمارا ہر جاننے والا نوکری کے لئے ابا جی کے پاس آتا۔ ان کی مدد کے لئے وہ مرزا منصور' مرزا طاہر' میرداؤد' مرزا مبارک' مرزا منور اور بعض اوقات مرزا ناصر سے رابطہ کر کے انہیں سفارشی خطوط لے دیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بھیرہ کے ایک صاحب "اعجاز احمد" اور "عبدالرحمٰن مانا" کو ہفتوں ربوہ ہمارے گھر قیام کرنا پڑا۔ جلسہ سالانہ پر تو لوگ ہمارے ہاں ڈیرے ڈال لیا کرتے تھے۔ مرزائی اکابرین ملازمت کے لئے سفارشی خطوط تو دے دیتے لیکن ہر سائل یہ شکایت کرتا کہ متعلقہ حکام مرزائی ہونے کے باوجود اپنے اکابرین کے خطوط کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ اتنی موثر سفارش کے باوجود لوگوں کو نوکری نہیں ملتی تھی۔ آخرکار یہ عقدہ بھی ایک مرزائی شہری نے حل کر دیا اور ابا جی کو بتایا "مرزائی نبوت زادے اپنی امت کے لیے تو جو سفارش کرتے ہیں وہ "ایک نمبر" ہوتی ہے جبکہ مسلمانوں کے لئے کی جانے والی سفارش "دو نمبر" ہوتی ہے۔۔ یعنی ان کے سفارشی خطوط پر ایک مخصوص علامت ڈال دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ٹال دیا جائے نوکری نہ دی جائے

ہمارے ایک رشتہ دار محمد عمر انجم مرحوم کو ڈی سی آفس لاہور میں ملازمت

درکار تھی۔ سابق وفاقی وزیر اور سیکرٹری ایف کے بندیال ان دنوں لاہور کے ڈپٹی کمشنر ہوا کرتے تھے۔ بندیال صاحب اگرچہ ابا جی کے منہ بولے بیٹے بنے ہوئے تھے اور ان سے کام کے لیے کسی شفارش کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم "سخت کمپٹیشن" کی بنا پر محمد عمر انجم مصر تھے کہ بندیال صاحب کو مرزا طاہر سے سفارش کرائی جائے کیونکہ وہ ان کے کلاس فیلو تھے۔ چنانچہ مرزا طاہر سے بات کی گئی تو وہ فوراً" مان گئے' مگر ابا جی نے کہا۔

"میاں صاحب! سفارش کرنا مگر وہ والی نہ کرنا"۔

"وہ والی کونسی صوفی صاحب؟" مرزا طاہر نے پوچھا

"وہی دو نمبر سفارش یعنی ٹال دو نوکری مت دو" - ابا جی نے برملا کہا۔

"اوہو! آپ کو یہ سب کس نے بتا دیا" مرزا طاہر نے حیران ہو کر کہا۔

ابا جی نے کہا "صاف ظاہر ہے ایسی لنکا تو کوئی گھر کا بھیدی ہی ڈھا سکتا ہے۔ آپ کے کسی امتی نے ہی بتایا ہو گا۔ بہرحال دو نمبر سفارشی خط نہ دینا"۔ اس پر مرزا طاہر نے "خالص خط" بندیال صاحب کے نام دیا۔ تاہم بندیال صاحب ابا جی سے ناراض ہوئے کہ جب ہمارے براہ راست تعلقات تھے تو مرزا طاہر سے سفارش کی کیا ضرورت تھی"۔

ایک بار ایک اور شخص نے ابا جی سے آ کر گلہ کیا کہ مرزا منصور کی دی ہوئی سفارشی چٹھی سے اس کا کام نہیں ہوا۔ ابا جی نے تو جا کر مرزا منصور کی خوب خبرلی۔ جس پر اس نے کہا۔

پیر جی! آپ ناراض نہ ہوا کریں۔ اب آپ ہمارے بھیدی ہو گئے ہیں آئندہ آپ کو "دو نمبر" سفارشی خط نہیں دیا جائے گا۔

ہمارا بیلدار متھیلا بڑا دبنگ اور نڈر مسلمان تھا اس کو مرزائیوں سے متھا لگانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار اس نے ایم ایم احمد کے بھائی مرزا مجید احمد سے اپنے کسی عزیز کے کام کے لیے سفارشی چٹھی لی' جو دو نمبر تھی۔ چنانچہ اس کا کام نہ ہوا۔ اس دوران مرزا مجید نے متھیلا کو کسی کام کے لئے بلا بھیجا۔ متھیلا نے اس کے ملازم سے کہا۔

میں سرکاری ملازم ہوں' کام باری سے کرتا ہوں' آج احمد نگر کے مہر عیسیٰ کی باری ہے۔ اس کا کام کر کے آؤں گا۔

چنانچہ جب متھیلا مرزا مجید کے گھر گیا تو وہ غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ ''مسٹر متھیلا! تمہیں معلوم نہیں ہم نے تمہیں بلایا تھا''۔ متھیلا نے کہا ''معلوم ہے تبھی تو آیا ہوں مگر ایک بات یاد رکھیں مجھے ''تم کی بجائے آپ کہیں ورنہ میں بھی اسی طرز تکلم میں بات کروں گا''۔

''میں تمہاری رپورٹ کروں گا''۔ مرزا مجید دھاڑے۔

''میں سرکاری ملازم ہوں تمہارا غلام نہیں ۔ تم رپورٹ کرو گے میں استعفیٰ دے دوں گا۔ رازق اللہ ہے۔ تنخواہ حکومت دیتی ہے' تم نہیں۔ میں تمہارے جھوٹے نبی کی امت نہیں جو تمہارے زیر بار ہوں''۔

متھیلا نے جواب دیا تو مرزا مجید نے اسے احسان فراموش کہہ دیا۔ یہ کہنے کی دیر تھی کہ متھیلا تو بھڑک اٹھا اور کہنے لگا۔

''احسان فراموش ہم ہیں یا تم' ہم سرکاری ملازم ہونے کے باوجود دیانتداری سے تم لوگوں کا کام کر دیتے ہیں۔ تم نے ایک سفارشی رقعہ دیا تو وہ بھی دو نمبر نکلا۔ جس سے کام بھی نہیں ہوا اور تم احسان نہ جانے کس بات کا جتلا رہے ہو''۔

متھیلا مرزا مجید کی خوب بے عزتی کر کے واپس آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ رپورٹ کرتا متھیلا نے خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ ابا جی نے اس پر مرزا ناصر کو لکھا۔

''آپ کے خاندان والے ہمارے سرکاری ملازموں کو تنگ کرتے ہیں۔ آج مرزا مجید نے متھیلا کے خلاف کارروائی کی دھمکی دی ہے تو کل لا محالہ وہ ہمارے خلاف بھی اقدام کریں گے۔ یہ طرز عمل درست نہیں اس طرح کام نہیں چلے گا۔ متھیلا نے مرزا مجید کے غلط رویے کے باعث استعفیٰ دے دیا ہے۔ لہٰذا اس سے معذرت کی جائے اور اسے استعفیٰ واپس لینے کے لئے کہا جائے''۔

یہ لکھنے کی دیر تھی مرزا ناصر نے فوری ایکشن لیا اور بالآخر مرزا مجید کو متھیلا

سے معافی مانگنا پڑی۔

ایک بار متھیلا رات کے وقت لالیاں سے ربوہ آیا تو شہر میں خدام الاحمدیہ کی ایک گشتی ٹیم نے اسے گھیر لیا اور پوچھا تم کون ہو۔

متھیلا نے جواب دیا "مسلمان"۔

ٹیم نے سوال کیا "مسلمان تو ہو لیکن احمدی بھی ہو کے نہیں"۔

متھیلا نے برجستہ کہا "ہاں احمدی ہوں مگر مرزائی نہیں' اپنے سچے نبی کالی کملی والے کا غلام ہوں"۔

اس پر ان لوگوں نے کہا "اسے جانے دو' لگتا ہے یہ غیر احمدی ہے"۔ متھیلا سے نہ رہا گیا فورا" جواب دیا "جس مرزے کو مان کر تم خود کو احمدی کہتے ہو' میں واقعی اس کو نہیں مانتا"۔

شہر میں پوش علاقے کے باسیوں کے لئے نواحی گاؤں "چھنی" سے پانی لایا جاتا تھا۔ لیکن لائن کے اس پار کے باسی جن کے ہاں میٹھا مگر پیٹ درد کرنے والا پانی آتا تھا' اس میٹھے پانی کی سہولت سے محروم تھے جو "آل نبوت" کو میسر تھی۔ چنانچہ انہیں ناقص پانی پینے سے پیٹ کا مروڑ' مروڑ کر رکھ دیتا تھا۔

غرباء پر چندہ کی جو آفت "مرزائی امت" کی طرف سے مسلط ہے اس کا تذکرہ اس سے پہلے کئی بار کیا جا چکا ہے۔ ہمارے پڑوس میں چاچا محمد حسین ایک بیمار اور لاچار شخص رہتا تھا۔ اس کی بیوی گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لئے مختلف گھروں کا کام کرتی تھی۔ مگر ان غریبوں کے لئے بھی چندہ دینا لازمی تھا۔ اس کی زبوں حالی دیکھ کر ابا جی سے رہا نہ گیا' وہ اسے لے کر مرزا منصور کے پاس گئے اور کہا "ظالمو! دیکھو یہ شخص کچھ کما نہیں سکتا لیکن تم لوگوں کو پالنے کے لیے چندہ باقاعدگی سے دیتا ہے۔ کچھ تو خوف خدا کرو"۔

مرزا منصور مروتا" خاموش رہے اور ابا جی سے کہا ہم محمد حسین کے لیے وظیفے کا انتظام کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اسے کمرے میں طلب کیا گیا۔ خوف کے مارے محمد حسین

تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مرزا منصور کا اس کے ساتھ طرز تخاطب ایسا تھا جیسا راعی کا رعایا کے ساتھ ہوتا ہے۔

"کیا کام کرتے ہو تم"

"جی جی' بیمار ہوں کوئی کام نہیں کر سکتا"۔ محمد حسین گڑگڑایا۔

"پھر گزر بسر کیسے ہوتی ہے"""۔ مرزا منصور نے پوچھا۔

"حضور! میری بیوی محنت مزدوری کرتی ہے" محمد حسین نے عرض کیا۔

"اپنا علاج کراؤ اور ٹھیک ہو کر کچھ کام کرو' کام کے بغیر کیسے زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ کتنے پیسوں میں تمہارا گزارا چل جائے گا"۔ مرزا منصور نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔

"حضور' خود جیسا پسند کریں"۔ محمد حسین نے التجا کی۔

پھر مرزا منصور نے ابا جی سے کہا "پیر جی آپ فکر نہ کریں اس کا اسی ہفتے ۸۰ روپے ماہوار وظیفہ شروع کر دیا جائے گا"۔

محمد حسین کا ۸۰ روپے ماہوار وظیفہ تو شروع ہو گیا مگر اس کے بلوجود اسے چندہ معاف نہ ہوا۔ ہمارا ایک کلاس فیلو سلیمان ایک مزدور کا بیٹا تھا۔ وہ اتنا غریب تھا کہ اس کے بقول اس کے گھر دال کے علاوہ کبھی کوئی چیز نہیں پکتی تھی۔ مگر وہ بیچارے بھی چندہ دیتے تھے۔ مرزائی مظلوموں پر ان کی جماعت سال میں صرف ایک بار لطف و کرم کرتی اور وہ جلسہ سالانہ کے ایام تھے جب انہیں ۹ دن مرکز کی طرف سے کھانا دیا جاتا تھا وہ صبح کو دال اور رات کو "سنڈھے" کے شوربے کی بالٹیاں بھر کر لاتے اور سال بھر کے دیئے ہوئے خراج کا ریوارڈ حاصل کرتے تھے۔

ربوہ کا سالانہ میلہ

ربوہ میں رمضان شریف کو کوئی اہمیت دی جاتی تھی نہ عیدین پر کسی مسرت کا کوئی اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہاں تو بس جلسہ سالانہ ہی عید اور بقر عید تھیں۔ فروری ۱۹۶۶ء کی بات ہے جب ربوہ میں ہمیں پہلا رمضان شریف گزارنے کا موقع ملا۔ ہمارے گھر میں روزہ اور تراویح کی باقاعدہ پابندی ہوتی تھی۔ میں سکول میں روزہ رکھ کر جاتا تو طلبہ میرا خوب مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اکثر ساتھی کہا کرتے:

"او توں روزہ رکھیا ہویا اے"۔

"ہاں تو" جواب دیا جاتا۔

"روزہ تو طلبہ پر فرض ہی نہیں۔ اس سے پڑھنے والوں کا دماغ کمزور ہو جاتا ہے"۔ یہ مرزائی طلبہ کی دلیل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مرزائی مکتبہ فکر کا فلسفہ یہ تھا کہ طلبہ، محنت کش اور بوڑھے روزہ سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب نے اس بارے میں اپنے "باطل نبی" کا ارشاد سنایا۔

"روزہ رکھنے سے انسان خصی ہو جاتا ہے"

ہمارے ایک استاد محمد ابراہیم بھانبڑی اپنے باوا کی اس فکر کی بنا پر کہا کرتے تھے روزہ جماعت پر اس لئے فرض نہیں کہ "مسیح موعود" نے اپنی امت کو اس جسمانی مشقت سے نجات دلا دی ہے۔ ان کا اس سلسلے میں یہ استدلال تھا کیونکہ کام بھی ایک عبادت ہے۔ روزے سے انسان کم غذا لیتا ہے اس وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ یوں اس کی استعداد کار کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کام جیسی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عبادت کے لئے دوسری عبادت ترک نہیں کی جاسکتی۔

ایک مرتبہ میں اپنے ابا جی کے ہمراہ مرزا ناصر کے فلاسفی کے پروفیسر بیٹے مرزا انس کے تعلیم الاسلام کالج کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ مرزا انس نے ابا جی سے کہا۔

"صوفی صاحب! آپ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میرا وزن کم ہو جائے"۔
ابا جی نے کہا "آپ روزے رکھا کریں"۔

"نہیں صوفی صاحب نہیں کوئی اور بات بتائیں ' روزہ رکھنے کے بعد انسان افطاری میں عام حالات سے بھی زیادہ کھا جاتا ہے۔ چنانچہ وزن کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتا ہے ویسے بھی روزہ قابل عمل عبادت نہیں"۔ مرزا انس نے جواب دیا۔

ربوہ میں روزہ اور تراویح کے نعم البدل کے طور پر روزانہ نماز ظہر سے عصر تک مسجد مبارک میں قرآن پاک کا درس ہوا کرتا تھا۔ جس میں ایک سپارہ کا ترجمہ و تفسیر بیان کی جاتی تھی۔ یہ درس سننا ہر شخص پر لازم تھا۔ رمضان میں سکول و کالج دوپہر ایک بجے بند ہو جاتے تھے اور تمام طلبہ و طالبات اور اساتذہ مسجد مبارک پہنچ جاتے تھے۔ کوئی طالب علم درس سنے یا نہ سنے مگر وہاں حاضری لازمی لگوانی پڑتی تھی۔ یہ پابندی رمضان کے ابتدائی ایام میں تو سختی سے کی جاتی تھی مگر رفتہ رفتہ لڑکے مسجد کے بجائے ادھر ادھر پہاڑوں میں گھومتے پھرتے رہتے۔ جبکہ اساتذہ بھی درس سننے کے بجائے گھر بھاگ جاتے تھے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ مسجد میں لوگ جاتے ہی نہیں تھے اور مولوی صاحب کو درس دیواروں کو سنانا پڑتا تھا۔ رمضان گزرتا تو عیدالفطر اس طرح منائی جاتی جس طرح مسلمان کرسمس مناتے ہیں۔ نہ نئے کپڑے سلوانے کا اہتمام کیا جاتا' دکانیں لگتیں نہ کوئی تفریحی پروگرام ہوتا۔ اس کے برعکس جلسہ سالانہ کی مہینوں پہلے تیاری شروع کر دی جاتی تھی۔

بقر عید پر بھی لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں گوشت دیتے نہ غیروں میں بانٹا جاتا تھا۔ جبکہ ہر شخص قربانی کا گوشت آدھا اپنے گھر رکھ لیتا اور آدھا صدر محلہ کو بھجوا دیتا' محلہ کا صدر گوشت کے ایک کلو کے پیکٹ بنا کر ان لوگوں کے گھروں میں بھیج دیا کرتا جو قربانی نہیں کرتے تھے۔ ہم ربوہ میں کیونکہ اکیلے تھے کوئی عزیز یا رشتہ دار تو تھا نہیں۔ چنانچہ جب ہم نے پڑوسیوں کو گوشت بھجوایا تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم نے خیال کیا کہ ہم مرزائی نہیں اس لیے یہ گوشت قبول کرنے سے گریز کر

رہے ہیں۔ ہم نے ایک پڑوسی ثناء اللہ زرگر سے پوچھا تو اس نے کہا بات احمدی غیر احمدی کی نہیں' قصہ یہ ہے کہ "حضور" کا حکم ہے کہ گوشت خود تقسیم کرنے کے بجائے صدر محلہ کے حوالے کرو وہ خود جس کو مناسب سمجھے گا' بھیجے گا۔

جلسہ سالانہ جسے عیدین پر فوقیت حاصل تھی' جلسہ کم میلہ زیادہ ہوتا تھا مرزائی جلسہ پر حاضری کو حج اور عمرے کے برابر سمجھتے تھے۔ مہینوں سے اس کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ زنانہ اور مردانہ سکول و کالج کے وسیع کھیل کے میدانوں میں "پرالی" کے پہاڑ لگ جایا کرتے تھے۔ امیر مرزائی تجوریوں کے منہ کھول دیتے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاپنگ کی جاتی جبکہ غریب مرزائی سال بھر کی جمع شدہ پونجی جلسہ پر خرچ کر ڈالتے تھے۔ ربوہ میں تین لنگر خانے اور ایک دارالضیافت تھا۔ اول الذکر تینوں سال بھر بند رہتے تھے لیکن جلسہ سالانہ کے دوران ۹ دن کے لئے کھول دیئے جاتے۔ یہاں گائے' بیل' اور بھینسوں کے ریوڑ کے ریوڑ لائے جاتے۔ جلسہ سالانہ پر آئے ہوئے مہمانوں کو صبح کے وقت "ماش کی چھلکوں" والی دال اور رات کو "سنڈھے" کا گوشت اور آلو پکا کر کھلایا جاتا۔ لنگر خانے سے روٹی کے حصول کے لئے باقاعدہ راشن کارڈ جاری کیا جاتا۔

جلسہ سالانہ پر اندرون ملک اور بیرون ملک سے مہمان آتے جس میں اکثریت اپنے ربوہ میں مقیم رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرا کرتی۔ تمام تعلیمی اداروں میں جلسہ کے دنوں میں چھٹیاں کر دی جاتیں اور ان کے کمروں میں بھی مرد و زن قیام کرتے اور پرالی پر سو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کسی کو جائے قیام نہ ملتی تو وہ خیموں میں سوتے اور ۲۶' ۲۷' ۲۸ دسمبر کی ٹھٹرتی راتوں میں اس چندہ خور خاندان کو بد دعائیں دیتے جو سارا سال پیسے لینے کے باوجود ان کے لئے رہائش کا مناسب انتظام بھی نہیں کرتا تھا۔ جلسہ پر سکولوں کے طلباء ' اساتذہ' شہریوں اور دیگر دفاتر کے اہلکاروں کی ڈیوٹیاں لگائی جاتیں جو مہمانوں کی خدمت کرتے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ "ظلی حج یعنی جلسہ سالانہ کے موقع پر ڈیوٹیاں لگاتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ ہر شعبے

میں ڈیوٹی دینے والے "خوش شکل امرد" لازمی شامل کیے جائیں تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کے آتش شوق کو سرد کریں۔ کئی خوب رو لڑکوں کو تختہ مشق بنانے کے لئے جلسہ سالانہ کا انتظار کیا جاتا اور ڈیوٹیوں کی آڑ میں انہیں شکار کیا جاتا تھا۔

مرزائی جلسہ پر اپنے خلیفہ کی تقاریر سنتے' شدید سردی میں "دال اور شورا" پیتے۔ پرالی پر سوتے' ڈیوٹیاں دیتے لور "در ثمین" کے اشعار پڑھتے تھے۔ ربوہ میں جلسہ پر مختلف سٹل لگتے انواع و اقسام کی نمائش لگتی' سرمہ' انگوٹھیاں' مٹھائیاں بیچنے کے علاوہ "وہ" دھندا بھی عروج پر ہوتا۔ اکثر لڑکے لڑکیاں اپنی غربت کا دوزخ سرد کرنے کے لئے جلسہ سالانہ کا انتظار کرتے لور ضمیر کو سلا کر مال کما لیا کرتے تھے۔

جلسہ سالانہ پر بہت سے لوگ تماشائی بن کر دوسرے شہروں سے حور و غلمان اور میلہ دیکھنے ربوہ آیا کرتے تھے۔ ایک بار ہماری بھیرہ کی ایک پڑوسن "زیبی پھانی" "ماچھن" مرزائیوں کا جلسہ دیکھنے ہمارے پاس ربوہ آ گئی۔ امی جان اسے جامع نصرت کالج کے زمانہ جلسہ گاہ میں لے گئیں۔ مرزا ناصر کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر سال جلسہ سالانہ کے آخر پر تجدید بیعت کراتے تھے۔ میں اور میرا بھائی امی جان کے ساتھ تھے اور وہ ہمارے ساتھ مصروف تھیں کہ اسی دوران مرزا ناصر کی اختتامی تقریر شروع ہو گئی۔ تقریر کے آغاز میں انہوں نے تمام حاضرین جلسہ کو تجدید بیعت کے لئے کہا۔ پہلے قرآنی آیات پھر درود پاک پڑھا گیا۔ بیچاری "زیبی پھانی" مرزا ناصر کے پیچھے آیات و درود پڑھنے لگی۔ جونہی مرزا ناصر نے کہا کہ "میں مرزا ناصر کے ہاتھ پر سلسلہ احمدیہ کی بیعت کرتی ہوں" ہماری امی جان نے بھاگ کر زیبی کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا:

"نی جھلئے' ایہہ مردود تے اپنی بیعت کران لگا ای' تو کافر ہونا اے"۔

زیبی جو روا روی میں مرزا ناصر کے ساتھ ساتھ پڑھے جا رہی تھی فوراً خاموش ہو گئی اور اس نے لاحول پڑھی۔ امی جان نے جب اسے روکا تو ان کی آواز سن کر بہت سی عورتیں ان کی طرف متوجہ ہوئیں کئی ایک نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے یہ کوئی غیر احمدی عورت ہے"۔

جلسہ سالانہ پر "مرزائی حوروں" کی بھی چاندی ہوا کرتی تھی۔ ان کی ڈیوٹیاں بھی حسین لڑکوں کی طرح مخصوص خدمات کے لئے لگائی جاتیں جن کا فیصلہ خاندان نبوت کے اکابرین کیا کرتے تھے۔ ڈیوٹیوں کی آڑ میں اکثر لڑکیاں گھروں سے باہر بہ آسانی رہ لیتی اور "من کی مراد" پالیتی تھیں۔

جلسہ پر ریلوے کے مرزائی حکام اعلیٰ ربوہ میں پہنچ جایا کرتے اور اس موقع پر خصوصی ٹرینیں چلائی جاتی تھیں۔ افسروں کے "سلیپر" کئی روز تک ربوہ میں کھڑے رہتے تھے۔ ربوہ کے اسٹیشن پر عام حالات میں کبھی ایک قلی بھی نظر نہیں آتا تھا مگر جلسہ کے ایام میں ہر گلی محلہ میں ایک ہی آواز "قلی مزدور قلی" گونجا کرتی تھی۔ سرخ کوٹ پہنے ہوئے لاہور کے لاتعداد قلی ربوہ پہنچ جایا کرتے تھے۔ جلسہ سالانہ کے افسر میر داؤد ہوا کرتے تھے۔ جن کی سرگردگی میں جلسہ کے جملہ کالے امور طے کیے جاتے تھے۔

ملک بھر کے تمام محکموں میں کلیدی آسامیوں پر فائز اعلیٰ حکام اور آفیسر جلسہ سالانہ پر جب ربوہ آتے تو سرکاری رازوں سے اپنے خلیفہ کو آگاہ کرتے اور پھر ان کے مشورے کے بعد پاکستان کو نقصان پہنچانے والے منصوبے تیار کرتے۔ جن دنوں ایک روپے کے نوٹ پر ایم ایم احمد کے "مرزا مظفر احمد" کے طور پر دستخط ہوتے تھے مرزائی نازاں ہو کر نوٹ ہمیں دکھایا کرتے۔ ایک مرتبہ جلسہ سالانہ میں مرزا ناصر نے اپنی تقریر میں کہا تھا' شاہ فیصل' اور ذوالفقار علی بھٹو مرزا غلام احمد کی پیشگوئی کے مطابق ان کی بد دعا سے قتل اور پھانسی چڑھے ہیں اور اب کرنل قذافی کی باری ہے۔ لیکن اتنے برس گزرنے کے بعد مرزا ناصر کی یہ جھوٹی پیش گوئی پوری نہیں ہوئی۔ مجموعی طور پر ربوہ کا جلسہ سالانہ ایک میلہ تھا۔ جہاں ہر چیز کی لوٹ سیل لگی ہوئی ہوتی تھی۔ ہر دکاندار یہ صدا لگا رہا ہوتا کہ "بولو جی تم کیا کیا خریدو گے"۔

کوفیوں کا شہر

مرزائیت اور بے وفائی میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس بناء پر ہمارے ایک مہربان ربوہ کو کوفیوں کا شہر کہا کرتے تھے۔ کوفی خاصیتوں کے باوجود ربوہ کے باسی خود کو وفادار اور چنیوٹ کے مسلمانوں کو بے وفا کہتے تھے۔ تاہم مولانا منظور چنیوٹی کے علاوہ انہیں چنیوٹ کی ہر چیز پسند تھی۔ پھر بھی وہ چنیوٹ کو اپنا حریف شہر سمجھتے تھے۔ مرزائیوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے جھوٹے نبی کی طرح مسلمانوں کو ہر قسم کی گالی دینے سے گریز نہیں کرتے لیکن اگر انہیں جواباً" کوئی تسلی آمیز جملہ کہا جائے تو ان کا چہرہ فوراً" اتر جاتا اور وہ ایک ہی گھسا پٹا جملہ بولتے ہیں۔

"یہ تو انسانیت سے گری ہوئی بات ہے"

ایک مرتبہ ہمارے ایک کلاس فیلو نے چنیوٹ کے ایک طالب علم کو "اہل کوفہ" کہا جس پر موخرالذکر نے جواباً" اسے "ابن زیاد" کہہ دیا۔ اس پر مرزائی لڑکے کا موڈ آف ہو گیا' اس کی شکل قابل دید تھی یوں لگتا تھا کہ اسے چشم تصور میں واقعی اپنا باپ "ابن زیاد" لگنے لگا ہو۔ مرزائیوں میں کوفیوں والی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ وہ آپس میں شدید دشمن بھی ہوں تو بھی مسلمانوں کی مخالفت میں سیسہ پلائی دیوار بن جایا کرتے ہیں۔ قیام ربوہ کے دوران بے شمار ایسے واقعات ہوئے جب ہمارے جگری دوست مسلمان دشمنی میں اپنے جیسے مرزائیوں سے اتحاد کو ثواب سمجھتے تھے۔ چنیوٹ میں ربوہ کے بے شمار مرزائی آباد ہیں اور تھے لا تعداد کا یہاں کاروبار ہے جبکہ چنیوٹ کے سینما گھر مرزائیوں کو تفریح فراہم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر مرزائی چنیوٹ کے خلاف گز بھر کی زبان کھولے ہوئے نظر آتا ہے۔

ربوہ میں سگریٹ نوشی ممنوع تھی مگر لوگ سرعام تمباکو نوشی کرتے تھے۔ ریڈیو لگانا منع تھا۔ مگر ٹیپ ریکارڈر پر دیسی اور بدیسی گانے سننے میں کوئی ممانعت نہ تھی۔

ہماری ایک جاننے والی بی اے کی طالبہ بصیرت ایک گانا "اولی ٹھنڈک نگاہوں کو تیرے دیدار سے ہو سکے تو آواز دے' آواز مجھ کو پیار سے' اس لے و لحن سے گاتی یوں لگتا جیسے مالا خود گا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا کلاس فیلو مومن "چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں" سنا کر محفل جما لیا کرتا تھا۔ جبکہ اعجاز اکبر "سجناں نے بوہے اگے چک تان لئی" مزے لے لے کر گاتا تھا۔ شکیل کی آواز بھی بے مثل تھی۔

ربوہ میں مرزائی نبوت نے سینما نہیں بننے دیا لیکن اس کی ضرورت چنیوٹ سے پوری کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہم لوگ جمعہ کی چھٹی گزار کر ہفتہ کو چنیوٹ سے سکول آتے تو ہمارے مرزائی ساتھی سب سے پہلا سوال یہ کرتے کہ شمع اور نیلم سینما میں کون سی نئی فلم آئی ہے۔ قدرت کے قہر سے مالا مال ربوہ شہر میں گرمیوں میں زندگی گزارنا انتہائی مشکل تھا۔ دوپہر کے وقت تو گھر سے باہر نکلنا تندور میں قدم رکھنے کے مترادف تھا۔ اس شہر کی کلر زدہ زمین جنگلی کیکروں کے علاوہ کوئی چیز اگلتی نہ تھی۔ ایسی صورت میں چنیوٹ کا پڑوس ربوہ کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ صبح سویرے چنیوٹ سے سبزی' ترکاری کے ریڑھے بھر کر ربوہ آتے۔ گوشت گیہوں بھی وہیں سے لایا جاتا۔ اس کے باوجود مرزائی چنیوٹ کو دشمن شہر کہا کرتے تھے۔

۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران چنیوٹ نے مرزائیوں کی جس انداز میں کمر توڑی انہیں اس کا صدمہ تو یاد تھا لیکن انہیں چنیوٹ کے بے پناہ احسان بھول گئے تھے۔ ۶۰ء کی دہائی میں ربوہ میں بنک نہیں ہوتے تھے جبکہ تحریک جدید اور صدر انجمن میں دو غیر قانونی بنک چلتے تھے لیکن بے شمار مرزائی مختلف بنکوں میں ملازم تھے۔ چنانچہ ان میں اکثریت کی خواہش ہوتی کہ ان کی پوسٹنگ چنیوٹ میں ہو جائے اور وہ گھر کے قریب رہیں۔ دواخانہ خدمت خلق کے حکیم بشیر کا بیٹا نصیر شاہ چنیوٹ کے نیشنل بینک میں مدتوں مینجر رہا ہے۔ چنیوٹ کے سرکاری ہسپتالوں میں تقرر کیے گئے مرزائی ڈاکٹروں کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرؤف غنی جیسے بے شمار ڈاکٹر چنیوٹ میں ملازمت

کرتے رہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی سرکاری محکموں کے ملازم چنیوٹ میں پوسٹنگ کروا کے ربوہ میں مقیم رہتے تھے۔

ڈاکٹر شریف وندان ساز' معراج' سراج ٹرنک ہاؤس' احمدیہ دار لباس اور اس قسم کے بے شمار کاروباری ادارے تھے جن کے مالک چنیوٹ میں موجیں کر رہے تھے اور اپنی محسن کشی کی فطرت کے باعث چنیوٹ کو بے وفا لوگوں کا شہر بھی کہا کرتے تھے۔

ربوہ کو پہاڑوں کے لا متناہی سلسلے نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے' جہاں سے پتھر کرش ہو کر دیگر شہروں کو سپلائی ہوتا ہے۔ اب تو ربوہ میں ٹرکوں کے کئی اڈے ہوں گے لیکن اس زمانے میں بجری سپلائی کرنے کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ چنیوٹ کے گڈز ٹرانسپورٹ کے اڈوں کے ذریعے ہی ربوہ کا کاروبار چلتا تھا۔ اکثر بجری کے ٹھیکیدار جن کا گھر بار ربوہ میں تھا لیکن وہ دن بھر چنیوٹ میں کام کرتے' جیب بھرتے اور رات کو کفرستان چلے جاتے تھے۔

چنیوٹ کے شہید چوک میں ایک کلینک دار الصحت تھا اس کو ایک مرزائی ڈاکٹر عبداللہ قریشی چلاتا تھا۔ اس کا بیٹا طاہر بن عبداللہ ہمارا کلاس فیلو تھا۔ موصوف اپنی سدومی صفات کے باعث سکول بھر میں چلتا پھرتا اشتہار تھا۔ طاہر بن عبداللہ نے ایک بار بتایا کہ اس کے باپ کا کلینک پہلے ربوہ میں ہوا کرتا تھا' لیکن کلینک پر مریض کوئی نہیں آتا تھا۔ مرزا منور کی اجارہ داری کے باعث دوسرے ڈاکٹر محض ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے تھے۔ چنانچہ طاہر کے والد نے اپنا کلینک چنیوٹ منتقل کیا تو چاندی برسنا شروع ہو گئی۔

ہمارے ایک اور کلاس فیلو احمد شریف کے والد بھی ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے لیکن رحمت بازار میں اپنے کلینک پر سارا دن مکھیاں مارا کرتے تھے۔ انہیں بھی کسی نے نیک مشورہ دیا اور کلینک چنیوٹ لانے کے لئے کہا۔ ڈاکٹر شریف اپنا کلینک چنیوٹ کیا لائے ان کی قسمت پھر گئی۔

تحریک ختم نبوت کے دنوں میں جب سماجی بائیکاٹ کے باعث ربوہ ملک بھر سے کٹ کر رہ گیا تب بھی بے شمار مرزائی اپنی فرنچ کٹ داڑھی صاف اور ٹوپی ٹھکانے لگا کر چوری چھپے چنیوٹ آتے اور وہاں سے سودا سلف لے کر ربوہ چلے جاتے تھے۔ جب چاروں طرف ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا تو ان دنوں میں بھی انہیں چنیوٹ سے ہی سہارا ملتا تھا۔ مرزائیوں کی بڑی تعداد نے جون ۷۴ء کے دنوں میں چنیوٹ آ کر اسلام قبول کیا اور مرزا قادیانی کی ذات' نبوت اور آل پر تین حرف بھیجے اور زندگیوں کی سہولتوں سے بہرہ مند ہوئے۔

ہماری کلاس میں ایک لڑکا امجد پڑھا کرتا تھا۔ اس کا والد چنیوٹ میں اے ڈی آئی تھا۔ یہ لوگ چنیوٹ سے منتقل ہو کر ربوہ آ گئے تو اس نے مرزائیوں کی احسان فراموشی پر ایک دن بڑی عمدہ بات کہی کہ ہم احسان شناس اس لئے نہیں' ہمارے نبی کی سنت میں ہی احسان مندی کی کوئی مثال ہی نہیں بلکہ ہمارا مذہب تو صرف "لو" کی بنیاد پر قائم ہے اس میں "دو" کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ چنانچہ ہم جیسے پڑھے ہیں' ایسے ہی پڑھائیں گے۔ امجد ترنگ میں آ کر تقریر کر رہا تھا' کہنے لگا "چنیوٹ ہم کو سینما کی شکل میں بہترین تفریح فراہم کرتا ہے۔ اس کے باوجود اگر ہمیں ہمارے اکابرین کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا جائے تو ہم سب سے پہلے چنیوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

مرزائی یہودیوں کی طرح بڑی سیانی قوم ہے۔ ان کی "نبوت" نے اگرچہ انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے لیکن اس کے باوجود مرزائیوں کی اکثریت اپنے مالی استحکام سے لمحہ بھر کے لئے غافل نہیں ہوتی۔ یہ بات ہر مرزائی جانتا تھا کہ ربوہ میں جائیداد خریدنا اپنا پیسہ کنوئیں میں پھینکنے کے مترادف ہے۔ اسی بناء پر بے شمار مرزائیوں نے چنیوٹ میں جائیدادیں خرید رکھی تھیں' چنیوٹ کے محلہ عثمان آباد میں ایک مرزائی خاندان نے جائیداد کی خرید و فروخت کا باقاعدہ کاروبار کیے رکھا اور مسلمانوں کی زمینیں انہیں سے خرید کر انہیں کو فروخت کر کے خوب مال کمایا۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر

رکھا جائے تو ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مرزائیوں نے ہر دور میں چنیوٹ سے فائدہ اٹھایا' مگر ہمیشہ اس محسن شہر کی بدخواہی کی۔ اس سلسلے میں ایک معمر مرزائی خدا بخش کی بات قابل ذکر ہے کہ "جس طرح مرزا نبی نہیں ہو سکتا اسی طرح مرزائی وفادار نہیں ہو سکتا۔

ربوہ میں قیام کے دوران ہم جمعہ کی نماز پڑھنے چنیوٹ جاتے تو اکثر کلاس فیلو مذاق کیا کرتے تھے کہ آخر تمہیں چنیوٹ میں نماز پڑھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں اس کا جواب یہ دیتا کہ تم لوگ چنیوٹ فلم دیکھنے جا سکتے ہو تو ہم نماز پڑھنے نہیں جا سکتے۔ اس پر وہ لوگ کہتے "بھئی چنیوٹ ہم فلم اس لئے دیکھنے جاتے ہیں کہ ربوہ میں کوئی سینما نہیں لیکن ربوہ میں مساجد ہونے کے باوجود تم لوگ چنیوٹ جمعہ پڑھنے جاتے ہو؟" میں ان کی زبان بند کرنے کے لئے کہتا کہ ربوہ میں مساجد نہیں مرزائی عبادت خانے ہیں۔ ہم یہاں نماز پڑھ کر اپنی نماز ضائع کیوں کریں۔

مرزائیت گزیدہ

اباجی نہایت سادہ اور درویش صفت انسان تھے۔ عمر بھر زہر ہلاہل کو قند نہ کہنے کے فلسفے پر کاربند رہ کر اپنوں کو خفا اور بیگانوں کو خوش کرتے رہے۔ ان کی بے نیاز شخصیت کا یہ اعجاز تھا کہ ربوہ جیسی غیر مسلموں کی بستی میں بھی دھڑلے سے رہے۔ متعصب لوگوں کے اس دیس میں بھی ان کے عقیدت مندوں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ مرزا ناصر سمیت "مرزائیت" کے بے شمار پجاری انہیں سلام کرنے آیا کرتے تھے۔

بڑے بڑے مرزائی علماء و فضلا جو ہر وقت مسلمانوں کو گھیر کر "مرزائیت" میں داخل کرنے پر ادھار کھائے رہتے تھے اباجی کے سامنے مہربلب ہو جاتے تھے اور ان کی روحانی عظمتوں کو مانتے تھے۔ بے شمار لوگ اباجی کی تحریک پر "مرزائیت" سے تائب ہو کر دامن اسلام میں داخل ہوئے۔

مرزائیوں کا یہ قاعدہ تھا کہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ اس کا نام رکھنے کے لئے اپنے خلیفہ کو ایک درخواست لکھتے' خلیفہ چند روز کے توقف کے بعد نام رکھ دیتا مرزا ناصر کے بیٹے مرزا انس کے گھر بیٹا پیدا ہوا تو اس نے نام رکھنے کے لئے اباجی سے درخواست کی تاہم انہوں نے مسکرا کر ٹال دیا۔

اباجی مسلسل تیس سال تک ۱۰ ماہ روزے اور رمضان میں اعتکاف کرتے رہے۔ ربوہ میں قیام کے زمانے میں وہ اعتکاف کرنے کے لئے بھیرہ چلے جایا کرتے تھے اور عیدالفطر سے اگلے روز واپس آتے تھے۔ اس دوران ہمارا سرکاری "بیلدار" متھیلا گھر کی اور ہماری نگرانی کیا کرتا تھا۔ ثواب کے اس کام میں اس کی شرکت بہت زیادہ تھی۔ وہ عید ہمارے پاس گزار کر اگلے روز اپنے بچوں کے پاس جایا کرتا تھا۔ اباجی کی شب بیداری اور سحر خیزی کے باعث بے شمار مرزائی عقیدت کے طور پر ان سے ملاقات کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ "تعویز دھاگے اور دم درود کے منکر ہونے کے باوجو

اکثریت چھپ چھپا کر ہمارے ہاں آتی اور اپنے درد کا درماں روحانی علاج میں تلاش کرتی۔

ہمارے پڑوسی مستری فضل دین کی بیٹی امتہ المتین ایک مرزائی سلیم کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی۔ سلیم لائل پور (فیصل آباد) میں ملازم تھا۔ وہاں اس کے ایک خاتون سے تعلقات ہو گئے۔ اس نے امتہ المتین کو دھوکے سے لائل پور بلایا اور اس سے دوسری شادی کے اجازت نامے پر دستخط کرا لیے۔ موصوفہ گھر لوٹی تو اس صدمے نے اس پر اس قدر اثر کیا کہ وہ پاگل ہو گئی۔ ابتدائی علاج کے لیے اسے فضل عمر ہسپتال ربوہ میں داخل کیا گیا مگر جب صورتحال قابو سے باہر ہو گئی تو اسے لاہور کے مینٹل ہسپتال میں منتقل کرا دیا گیا۔ کافی علاج کے باوجود اسے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اس کے گھر والے اسے واپس ربوہ لے آئے۔ اب امتہ المتین دن رات چھت پر چڑھ کر اپنے ماں باپ' مرزائی نبی' اس کے خاندان کو انتہائی فحش گالیاں دیا کرتی تھی۔ اس کے گھر والے اور محلے دار اس کیفیت سے سخت پریشان اور نالاں تھے۔ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ ہم سب کے ساتھ نہایت پیار اور ادب و احترام سے پیش آتی۔ ابا جی صحن میں نماز پڑھ رہے ہوتے تو وہ بڑی عقیدت سے انہیں دیکھا کرتی۔ ایک روز اس کی والدہ رشیدہ بیگم ابا جی کے پاس آئی اور عرض کی "صوفی صاحب! ہم ہیں تو احمدی' آپ سے بات کرنا بھلا معلوم نہیں ہوتا لیکن مجبور ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا"۔

ابا جی نے کہا "بہن! بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔

کہنے لگی "آپ میری بیٹی امتہ المتین کو کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے وہ ٹھیک ہو جائے"۔ ابا جی نے جواب دیا "آپ لوگ ان چیزوں پر یقین رکھتے ہیں؟ یہ تو ان لوگوں کے لئے ہیں جن کا ان پر کامل اعتقاد ہوتا ہے"۔

اس پر رشیدہ بیگم رونے لگ گئی اور کہا "احمدیت" بے شک ہمارا مذہب ہے لیکن اسے ہم نے بادل نخواستہ قبول کر رکھا ہے۔ اسے چھوڑیں تو جائیداد' رشتہ دار

اور سماجی تعلقات جاتے ہیں اس کے اختیار کرنے سے جو کچھ ہم نے کھویا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر ہم پر ترس کھائیں مجھ سے اپنی بیٹی کی حالت دیکھی نہیں جاتی"۔

ابا جی نے امتہ المتین کو کچھ تعویذ اور پانی دم کر کے دینا شروع کیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند یوم میں وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ وہ ابا جی کی اس قدر معتقد ہوئی کہ باقاعدگی سے آکر دین کی باتیں پوچھنے لگی۔ تاہم ٹھیک ہونے کے بعد بھی اس نے مرزا قادیانی اور اس کے دین کو برا بھلا اور جھوٹا کہنا نہ چھوڑا وہ سرعام کہتی "مرزا غلام احمد قادیانی ایک جھوٹا اور مکار انسان تھا۔ یہ صوررت حال دیکھ کر مرزائی اسے پاگل سمجھتے مگر درحقیقت وہ بالکل نارمل تھی جس کو اس کے گھر والے بھی تسلیم کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے امتہ المتین سے پوچھا کہ تم کس ڈاکٹر کے علاج سے تندرست ہوئی تو اس نے کہا "میں تو صوفی صاحب کے دم کئے ہوئے پانی سے ٹھیک ہوئی ہوں"۔ سوال کرنے والے مرزائی نے اس بات پر یقین نہ کیا اور دم کئے ہوئے پانی کو لیبارٹری میں ٹیسٹ کروایا۔ جب وہاں پانی محض خالص پانی ثابت ہوا تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ مسلمان سچے یا وہ اور اس کا مذہب "مرزائیت"۔

مرزا ناصر کا چچازاد بھائی مرزا منصور ناظر امور عامہ ابا جی کو ہمیشہ "پیر جی" کہا کرتا تھا۔ ایک بار میں ابا جی کے ساتھ مرزا منصور کے دفتر گیا۔ وہاں ایک شخص مرزا منصور سے گفتگو کے دوران دعا کی درخواست کر رہا تھا۔ جس پر مرزا منصور نے "ابا جی" کی طرف اشارہ کر کے کہا "دعا کرانی ہے تو پیر جی سے کراؤ' ہم تو انہیں سے دعا کی درخواست کرتے ہیں" وہ شخص ابا جی کو دیکھ کر کہنے لگا "کیا یہ صحابی ہیں" اس پر ابا جی نے کہا "نہیں میں صحابی نہیں سچا مسلمان اور کالی کملی والے کا غلام ہوں"۔

ربوہ کے ہی ایک مرزائی کی چھ بیٹیاں تھیں۔ ان کی شادیاں نہیں ہو رہی تھیں وہ بہت ہی متفکر تھا۔ اپنے "مرزوں" سے بار بار دعائیں کرا کے مایوس ہو چکا تو اسے کسی نے ہمارے ہاں بھیج دیا۔ ابا جی نے اسے کہا کہ تم "مرزائیت" سے تائب ہو جاؤ

اللہ تعالیٰ تمہاری مشکل آسان کر دے گا۔ اس نے واقعی ایسا کیا اور قدرت نے چھ ماہ کے اندر اس کی تمام بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کر کے اسے سرخرو کر دیا۔

۲۲ رجب کو حضرت امام جعفر صادقؓ کی نیاز ہم برسوں سے دیا کرتے تھے چنانچہ ربوہ آ کر بھی یہ معمول برقرار رہا۔ ہم مرزائیوں کے بجائے چمن عباس سے لوگوں کو بلا کر نیاز کی چیزیں کھلاتے لیکن جب ہمارے مرزائی محلہ داروں کو پتہ چلا تو انہوں نے از خود ہمارے ہاں آ کر نیاز کھانا شروع کر دی اور پانچ برس تک کھاتے رہے بلکہ رجب کے آغاز میں ہی نیاز کے بارے میں ہم سے دریافت کرنا شروع کر دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ ہم وادی عزیز میں جمعہ کی نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ بعد نماز وہاں اللہ ھو کا ذکر شروع ہو گیا۔ لوگ آنکھیں بند کر کے اللہ ھو کی ضرب اپنے دل پر لگانے میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ جب ذکر ختم ہوا تو ہم نے دیکھا کہ ربوہ کے بے شمار لڑکے وہاں کھڑے تھے اور حیرت زدہ ہو کر ذکر کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ صوفی محمد علی صاحب نے اپنے خادموں سے کہا کہ ان لڑکوں کو یہاں بلا لاؤ' لڑکے آئے تو صوفی صاحب نے پوچھا:

"بیٹا آپ کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئے ہیں" تو انہوں نے جواب دیا ہم احمدی لڑکے ہیں اور ربوہ سے یہاں شکار کی تلاش میں نکلے تھے' گھومتے گھومتے اس طرف آ نکلے۔ یہاں اللہ کے ذکر کی بلند آواز سنی تو بے ساختہ ادھر چلے آئے"۔

صوفی صاحب نے پوچھا! "تو پھر تمہیں ذکر کیسا لگا؟"

"ایسا طریقہ ذکر ہم نے کبھی سنا نہ تھا' لیکن اس میں عجیب سی لذت محسوس ہوئی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہم بھی اس طرح بلند آواز سے اپنے رب کو پکاریں"۔ لڑکوں نے جواب دیا۔ مگر ہمارے ہاں تو نماز کے بعد دعا بھی نہیں مانگی جاتی بلکہ نماز کے بعد کچھ پڑھنے اور کرنے کا سلسلہ اس لئے منع ہے کہ نماز کا مطلب ہی دعا ہے' آپ لوگوں کو نماز پڑھتے یا دعا مانگتے اور خدا کا ذکر کرتے ہوئے دیکھ کر عجیب سا سکون ملا ہے۔ لڑکے بے ساختہ کہے جا رہے تھے۔

صوفی صاحب نے کہا "تو بیٹا تم بھی اس طرح کا ذکر کیا کرو"۔

"مگر کیسے، ہم تو احمدی ہیں، ہمیں تو مسلمانوں سے ملنے جلنے سے بھی منع کیا جاتا ہے۔ ہم خود مختار بھی نہیں کہ خود کوئی فیصلہ کر سکیں"۔ لڑکوں نے پھر کہا۔

صوفی صاحب نے کہا "دیکھو بچو، ہم تمہیں اپنے والدین کے خلاف بغاوت کا سبق تو نہیں دیتے لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ خدا کی راہ میں گھر بار، والدین اور عزیز و اقارب چھوڑ دینا عین عبادت ہے۔ تمہیں اگر خدا کا ذکر اچھا لگا ہے تو تم اس پر غور کرو، زندگی میں جونہی موقعہ ملے اس طرف چلے آنا۔ لڑکے بہت متاثر ہوئے اور صوفی صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ خود مختار ہوتے ہی احمدیت سے تائب ہو کر آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے"۔ بعد ازاں سکول میں یہ لڑکے اکثر میرے ساتھ ذکر و فکر کی باتیں کیا کرتے تھے، ان کے ذہن اس قدر تبدیل ہو چکے تھے کہ لگتا تھا کہ زندگی میں موقع ملتے ہی کفرو الحاد چھوڑ کر "دین مبین" اختیار کر لیں گے۔

مرزائیوں کے زبردست مہروں میں شیخ نورالحق، شیخ شمس الحق ڈپو والے، فاروق جنرل سٹور کے مالک ارشد، پروفیسر محمد شریف خالد سمیت بے شمار مرزائی اکثر و بیشتر اباجی کے پاس حاضری دیتے اور دعا کرانے آیا کرتے تھے۔ اباجی ان سب سے کہتے کہ دعا کا فائدہ تو تب پہنچے گا جب تم طاغوت کے راستے کو چھوڑ کر حق کی راہ پر چلنا شروع کر دو گے، آپ برملا کہہ دیا کرتے تھے کہ "یہ دنیا اور جاہ و حشمت عارضی ہے تم لوگ کل خدا کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤ گے کہ تم نے ایک سچے نبی ﷺ کے پیروکار ہوتے ہوئے ایک جھوٹے نبی کی پرستش شروع کر دی"۔

یہ تمام لوگ بلا تامل اباجی کی باتوں کو سچا کہتے اور ان کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ صوفی صاحب! آپ سچ کہتے ہیں ہمیں بھی اپنی گمراہی کا پورا احساس ہے لیکن ہم کیا کریں ہماری جان نہیں چھوٹ سکتی آپ ہمارے لئے دعا کریں"۔

ربوہ، جہاں ایک طرف مرزائیت میں "کانوں" تک پھنسے ہوئے لوگ اس کفر کی دلدل سے نکلنے کے لیے بے تاب تھے، دوسری طرف وہاں کئی زندیق ایسے بھی تھے

جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے جیسے کافر بنانے کا عہد کر رکھا تھا۔ ایک "بوڑھا زندیق" اپنی جماعت کی طرف سے خصوصی بھتہ لینے کی وجہ سے ہر وقت احمدیت کا پرچار کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے اس تبلیغی جنون کی وجہ سے اکثر مرزائی بھی اس سے نالاں تھے۔ ربوہ کے ایک فوٹوگرافر نے اس "زندیق بڈھے" کے بارے میں ابا جی کو بتایا کہ اس کو لوگوں کے مرزائی بننے سے کوئی غرض نہیں ہوتی' اسے تو اپنی "دھیاڑی" کی فکر ہوتی ہے۔ جب کوئی مسلمان مرزائی چنگل میں پھنس جاتا ہے یہ "خبیث" سمجھتا ہے "دھیاڑی" لگ گئی۔

ابا جی نے کافی عرصہ تک چمن عباس کی مسجد میں جمعہ کی نماز کا سلسلہ شروع کیے رکھا۔ چنیوٹ کے شریف بخاری صاحب وہاں خطبہ دینے آیا کرتے تھے مگر جب ہم نے ربوہ سے نقل مکانی کی تو یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

اقبال دشمنی

علامہ اقبالؒ نے قادیانیت کو کھلم کھلا الگ مذہب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو ان کے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ ہر گھڑی' ہر ساعت علامہ کی مخالفت میں سرگرم رہتے ہیں۔ جن دنوں میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا' ان دنوں ملک بھر کے دیگر مدارس میں صبح اسمبلی کے وقت علامہ اقبال کی یہ دعا پڑھائی جاتی تھی۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اسی راہ پہ چلانا مجھ کو

اس کے برعکس ہمارے ہیڈ ماسٹر ملک حبیب الرحمٰن کے حکم پر سکول میں اسمبلی کے دوران کلام محمود کی یہ نظم کلام اقبال کا ہم پلہ قرار دے کر پڑھائی جاتی

تھی۔

نونہالان جماعت مجھے کچھ کہنا ہے
پر ہے یہ شرط کہ ضائع میرا پیغام نہ ہو
خدمت دین کو اک فضل الٰہی جانو
اس کے بدلے میں کبھی طالب انعام نہ ہو
جب گزر جائیں گے ہم تم پہ پڑے گا سب بار
سستیاں ترک کرو طالب آرام نہ ہو
میری تو حق میں تمہارے یہ دعا ہے پیارو
سر پہ اللہ کا سایہ رہے ناکام نہ ہو

جس کو شاعری سے ذرا سا بھی شغف ہے وہ کلام محمود کا اقبال کی شاعری سے موازنہ کرنے کی جسارت ہی نہیں کر سکتا۔ لیکن مرزائی علامہ سے محض اس وجہ سے بغض و عناد رکھتے ہیں کیونکہ جس طرح انہوں نے پاکستان کا عظیم تصور پیش کیا اسی طرح اس پیکر حکمت نے مرزائیت کو خطرے کی گھنٹی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ قادیانیت' یہودیت کا چربہ ہے۔

میں قیام ربوہ کے دوران متجسس رہا کہ مجھے مرزائیوں کے علامہ سے عناد کے اصل اسباب معلوم ہو سکیں تاہم اس بارے میں آغا شورش کاشمیری کی تصنیف' سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سوانح حیات سے لی گئی جملہ تفصیلات یہاں رقم ہیں ان سے مرزائیوں کی علامہ" سے نفرت کی اصل وجوہات معلوم ہو جاتی ہیں۔

"علامہ اقبال نے تحریک مرزائیت کے مالہ و ماعلیہ کا مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ کیا اور مرزائیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت دینے کے مجوز بنے۔ ان کے مرزائیت سے متعلق افکار بلاشبہ حرف آخر ہیں۔ علامہ اقبال کی ہمنوائی میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج مرزا اسد ظفر علی نے بھی دلائل سے ثابت کیا کہ قومیں نبوتوں کی بنا پر معرض وجود میں آتی ہیں اور الگ الگ شمار ہوتی ہیں۔ علامہ کے الفاظ میں مرزائیت نہ

صرف مسلمانوں کی وحدت کے لئے خطرہ ہے بلکہ اپنے اندر یہودیت کی خصوصیت رکھتی ہے۔ مرزا غلام احمد کی نبوت کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے کہا نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ختم نبوت کے عقیدے کی پوری طرح سمجھ نہیں اور نہ ہی ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور کیا گیا ہے۔ مغربیت کی ہوا نے ان مسلمانوں کو فقط نفس کے جذبے سے ہی عاری کر دیا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ ۱۷۹۹ء میں شروع ہوئی' اس کی روشنی میں مرزائیت کے اصل مظروف سمجھے جا سکتے ہیں۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں یہ سال بے حد اہم ہے۔ اس سال ٹیپو کو شکست ہوئی۔ اسی سال "جنگ نوارینو" وقوع پذیر ہوئی جس میں ترکی کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ سلطان ٹیپو کے مزار پر درج تاریخ شہادت اور مغربی شہنشاہیت کی ایشیا میں آمد کے بعد اسلامی ہندوستان میں چند اہم سوال پیدا ہو گئے ہیں۔ "کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ ہندوستانی مسلمان اور وہ مسلمان جو ترکی سے باہر ہیں' ترکی کی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟

ہندوستان دارالحرب ہے۔ اسلام میں نظریہ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت "**اولی الامر منکم**" میں منکم کا مفہوم کیا ہے؟ احادیث میں مہدی کے ورود کی پیشین گوئی کیا نوعیت رکھتی ہے؟ اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتا" صرف ہندوستانی مسلمانوں سے تھا اور سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا افسوسناک باب ہیں۔

چونکہ مسلمانوں کو صرف ایک چیز ہی قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے۔ لہٰذا غیر ملکی شہنشاہیت کی خدمت گزاری کے لیے ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی' جسے مرزائیت نے فراہم کیا۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر میں مرزائیت کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیاد فراہم کرنا تھا۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں جہاں دیگر اقطاع ہند کے مقابلے میں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے' تحریک مرزائیت سیاسی دینیات کا درجہ رکھتی ہے' بالخصوص پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا

فرسودہ حال اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار ہے۔ غرض مرزائیت دوسرے اسباب کے علاوہ لوگوں کے روحانی افلاس کی پیداوار ہے۔

علامہؒ فرماتے ہیں میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا نہ مرززائیت کے بانی ہی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لئے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لئے لوگوں میں ابھی شعور نہیں آیا۔ مسلمان ان تحریکوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لئے خطرناک ہوں چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت، جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہوں لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لئے خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لئے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں ختم نبوت کا تخیل غالباً" سب سے انوکھا تخیل ہے جس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے موبدانہ تمدن کی تاریخ سے ہی ہو سکتا ہے۔ "بہائیت" قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخرالذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے مگر باطنی طور پر اسلام کی روح اور عقائد کے لئے مہلک ہے۔ قادیانی جماعت کی ختم نبوت کے متعلق تمام تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ اس کا شمار حلقہ اسلام میں ہو تاکہ اسے سیاسی فوائد حاصل ہو سکیں۔ "ختم نبوت" ایک سیاسی اور اجتماعی مگر مکمل اور اسلامی تنظیم ہے جیسے عرفاً" اسلام کہتے ہیں۔ محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ مرزائیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک مرزائیت کا بانی ایسے ہی الہام کا حامل تھا۔ لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں جب بانی مرزائیت کی نفسیات کا مطالعہ اس

کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف نبی یعنی تحریک مرزائیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کرتا ہے اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم النبیین پر متصرف ہو جاتا ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے اس قول پر کہ "ایک مسلمان ولی کے لیے اپنے روحانی ارتقاء کے دوران اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے' جو شعور نبوت سے مختص ہو"۔

علامہؒ فرماتے ہیں کہ اگر شیخ کو اپنے کشف میں یہ نظر آ جاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنہیں تصوف کا شوق ہے' ان کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں پیغمبر اسلام کی ختم المرسلینی سے انکار کر دیں گے تو وہ یقیناً" علمائے ہند سے بھی پہلے مسلمانان عالم کو ایسے غداران اسلام سے متنبہ کر دیتے۔ جب کسی قوم کی زندگی کا انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے۔ ان لوگوں کی قوت ارادی پر غور کرو جنہیں اسلام کی بنیاد پر تلقین کی جاتی ہے کہ ایسے ماحول کو اٹل سمجھو۔ بس میرے خیال میں یہ وہ تمام ایکٹر جنہوں نے مرزائیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے' زوال اور انحطاط کے ہاتھوں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ علامہ فرماتے ہیں۔ قادیانی اور نہو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے دل میں مسلمانان ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ قادیانی بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری سے سخت مضطرب ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانان ہندوستان کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا مقصد فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت پیدا کریں۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں۔ مرزائیت اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ میں نے تحریک مرزائیت کے ایک رکن کو خود اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے ہوئے سنا۔ سیاسی نقطہ نظر سے وحدت اسلامی اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب

اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت' جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا' صرف اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جا سکتی ہے اور بس یہ وہ حقائق ہیں جن سے مرزائیت کو سب سے پہلے کافر مذہب علامہ اقبال نے قرار دیا اور انہوں نے اپنے مطالعہ سے مرزا قادیانی کو خدا کا باغی' دین کا قاتل اور رسول اللہ ﷺ کا دشمن قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو علامہ سے خاص بغض تھا۔

میں نے کئی مرزائیوں سے سنا کہ اگر علامہ اقبالؒ اور شورش کاشمیری مرزائی ہوتے تو مرزائیت کو کوئی خطرہ نہیں تھا' وہ دنوں میں پھلتی پھولتی اور دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیتی۔ یہاں اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرزائی امت کو اپنے جھوٹے نبی کی تصدیق کے لیے علامہ اقبال اور شورش کاشمیری جیسے عاشقان رسول ﷺ کی کتنی ضرورت تھی۔ دردغ بر گردن راوی اکثر مرزائی علامہ اقبال پر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ پہلے مرزائی تھے اور بعد میں انہوں نے اس مذہب کو چھوڑ دیا حالانکہ علامہ اقبال کی بالغ نظری کو جدید و قدیم کی اس چپقلش کا تازیست احساس رہا۔ انہوں نے مرزائیوں کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے ان میں کئی جگہ عقیدے کو اپنے ناخن فکر سے کھولا۔ یہی وہ عوامل ہیں جو مرزائی نبی اور اس کے برگ و بار خلفاء اور امت کو علامہ صاحب کی ذات کے خلاف زہر اگلنے پر مجبور کرتے رہے۔

بھارتی روز نامے "سٹیٹس مین دہلی" کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ علامہ انگریزوں کو کھلے خطوط تحریر کرتے رہے جن میں قادیانیوں اور مسلمانوں کی نزاع کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کیا گیا۔

ہم لوگ جب ایف۔ اے میں پڑھتے تھے تو ہمارے نصاب میں علامہ اقبالؒ کا یہ کلام شامل تھا۔

کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ میری حدیث گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں
نہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا! تجھے کیا ملے گا نماز میں

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی نے یہ کلام پڑھاتے ہوئے زہر اگلا کہ علامہ کی اس نظم کا توڑ مرزا غلام احمد کی بیٹی نواب مبارکہ بیگم نے اپنی کتاب "در عدن" میں کر دیا ہے جس کا مطالعہ کر کے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوفہ کی فکر علامہ اقبال سے کتنی بلند ہے۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کہاں "راجہ بھون کہاں گنگو تیلی" یہ شخص ایک عظیم انسان کو کس "جنس کاسد" کے ساتھ ملا رہا ہے۔ نواب مبارک بیگم کا کلام ملاحظہ ہو۔

مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
جو خلوص دل کی رمق بھی ہے ترے ادعائے نیاز میں
تیرے دل میں میرا ظہور ہے، تیرا سر ہی خود سر طور ہے

تیری آنکھ میں میرا نور ہے، مجھے کون کہتا ہے دور ہے
مجھے دیکھتا جو تو نہیں تو یہ تیری نظر کا قصور ہے
مجھے دیکھ طالب منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
مجھے دیکھ رفعت کوہ میں مجھے دیکھ پستی کاہ میں
مجھے دیکھ عجز فقیر میں، مجھے دیکھ شوکت شاہ میں
نہ دکھائی دوں تو یہ فکر کر کہیں فرق ہو نہ نگاہ میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
کبھی بلبلوں کی صدا میں سن کبھی دیکھ گل کے نکھار میں
میری ایک شان خزاں میں ہے میری ایک شان بہار میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
میرا نور شکل ہلال میں میرا حسن بدر کمال میں
کبھی دیکھ طرز جمال میں کبھی دیکھ شان جلال میں
رگ جاں سے ہوں میں قریب تر، تیرا دل ہے کس کے خیال میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں

مرزائی امت اس بات کی شدت سے خواہش مند تھی کہ وہ حضرت علامہ اقبال کے مد مقابل کے طور پر اپنے ہاں کوئی ایسی شخصیت سامنے لائے لیکن ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں کہ دانائے راز صدیوں میں آتا ہے جس کا مقابلہ مرزا غلام احمد جیسے مسلمہ کذاب نہیں کر سکتے۔ اکثر مرزائی کلاس فیلو یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ ان کے نبی کے فیض کے اثر سے سب سے زیادہ مرزائی شہر اقبال سیالکوٹ میں ہوئے ہیں۔ قصہ مختصر

مرزائیوں نے مرزا غلام احمد کی شان بلند کرنے کے لئے جس طرح کئی پاپڑ بیلے' اسی طرح علامہ کے مرتبہ کو کم کرنے کے لئے بے شمار حربے استعمال کیے' لیکن نہ وہ اپنے "نبی" کا مقام بلند کر سکے نہ علامہ کی شان گھٹا سکے۔

اسی طرح ہمارے سکول میں ایک مرزائی شاعر صوفی علی محمد کا بیٹا اعجاز اکبر اکثر دو قصے "علی دا ملنگ" اور "مہدی دا ملنگ" سنایا کرتا تھا۔ پہلے قصے میں علی کے ملنگ کی انتہائی تضحیک اور اہانت کی جاتی تھی جبکہ دوسرے میں مہدی کے ملنگ کو ایک عظیم مرتبے پر فائز دکھایا جاتا تھا۔ یہ قصہ شہر میں اکثر صوفی علی محمد کے بیٹے یوں پڑھتے ہوئے نظر آتے تھے جیسے بھیک مانگنے والے فقیر منظوم قصے گا کر خیرات طلب کرتے ہیں۔

یہاں سیلاب نہیں، آسمانی عذاب آئے گا

۱۹۶۹ء میں ابا جی کا تبادلہ ہوا تو ہم چنیوٹ آ گئے۔ میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ تاہم تعلیمی سلسلہ ربوہ میں ہی برقرار رہا۔ ۱۹۷۰ء میں میٹرک پاس کر کے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے لیا۔ قاضی اسلم اگرچہ کالج کے پرنسپل تھے۔ مگر عملاً" کالج پر حکمرانی وائس پرنسپل صوفی بشارت الرحمٰن کی تھی۔ ان کی سخت گیری کے باعث انہیں تمام طلبہ "صوفی مصیبت الرحمٰن" کہا کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ ربوہ کی الفضل والی جس گلی میں ہم مقیم رہے اسی میں صوفی بشارت کا بھی گھر تھا۔ تعصب اور صوفی بشارت ایک چیز کے دو نام تھے۔ ابا جی کی ربوہ میں مقبولیت اور لوگوں کی ان سے عقیدت صوفی بشارت کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ چنانچہ کالج میرے داخل کے سلسلے میں صوفی بشارت نے بہت روڑے اٹکائے مگر ہمیشہ کی طرح انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم لوگ چنیوٹ سے صبح کے وقت لاہور سے سرگودھا آنے والی ریل کار پر ربوہ آتے اور دوپہر کے وقت فیصل آباد جانے والی پسنجر ٹرین پر واپس چنیوٹ جایا کرتے تھے۔

کالج کا ماحول بھی بالکل تعلیم الاسلام ہائی سکول جیسا تھا۔ یہاں بھی مذہبی حوالے سے مرزائی اجارہ داری تھی۔ نصابی مضامین کے علاوہ ایک اضافی مضمون "تھیالوجی" ہر طالب علم پر پڑھنا لازم تھا اور مرزائی کتب پر مشتمل تھا۔ کالج کے یونیفارم میں "موٹی" کالی ٹوپی اور سیاہ انڈر گریجویٹ گاؤن شامل تھا۔ کالج کے تمام اساتذہ بظاہر خوش مزاج مگر تعصب کے "پرکالے" تھے۔ ہمیں اردو ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ اپنے پیریڈ میں کسی نہ کسی بہانے مرزائیت کا پرچار جاری رکھا کرتے تھے۔ انہیں کالج کی طرف سے آفس کے لئے جو کمرہ دیا گیا تھا وہ درحقیقت ایک "کشادہ غسل خانہ" تھا چنانچہ جب بھی کسی لڑکے کو کمرے میں بلانا مقصود ہوتا تو وہ

کہتے "ارے میاں ذرا میرے غسل خانے میں آ جانا"۔

جو لڑکے کمرے کی حقیقت سے واقف تھے انہیں تو کوئی حیرت نہ ہوتی لیکن نئے لڑکے ایک مرتبہ تو گھبرا جاتے۔ ان کی گھبراہٹ اپنی جگہ بجا ہوتی کیونکہ ربوہ کے اساتذہ کی اکثریت "گے کلچر" کی خوگر تھی۔ کلاس میں پروازی صاحب اکثر لڑکوں سے پوچھا کرتے بھئی! آپ نے کبھی عشق فرمایا ہے؟ لڑکے بھی جواباً پوچھتے "سر! آپ نے کبھی فرمایا ہے؟ اس پر پروازی صاحب کہتے میں نے عشق فرمایا نہیں کیا ہے۔ اور جن سے کیا وہ میری اہلیہ ہیں"۔ ہمارے ایک کلاس فیلو نعیم شلہ سے انہوں نے پوچھا کیا تم نے کبھی عشق فرمایا ہے؟ "کہا جی" پوچھا "کس کے ساتھ؟" نعیم شلہ نے کہا جناب محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ۔ اس پر پروازی صاحب فرمانے لگے بھئی دیکھ لینا کہیں وہ لڑکا نہ ہو اور تمہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں"۔

صوفی بشارت ایم اے عربی کی کلاسیں لیا کرتے تھے۔ جن میں لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ کلاس روم کے وسط میں ایک بڑا سا پردہ لگا دیا گیا تھا جس کے دوسری طرف لڑکے ہوتے تھے۔ درمیان میں یعنی دونوں اصناف کے سامنے صوفی صاحب براجمان ہوتے تھے۔ ان پر لڑکیوں کے روئے جمال دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی تاہم لڑکوں کے لئے ان کی ہم جماعت لڑکیاں شجر ممنوعہ تھیں جن کی طرف دیکھنا زنداں میں جانے کے مترادف تھا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکا اپنے لمبے قد کی وجہ سے دھر لیا گیا۔ موصوف ایم اے عربی کا طالب علم تھا اس کا "لمبا قد" کمرے میں معلق پردے سے اونچا تھا۔ وہ کلاس میں کھڑا تھا کہ اس دوران صوفی بشارت کلاس میں وارد ہوئے انہوں نے سمجھا لڑکا پردے کے اس پار کسی "پری" کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا قہر بشارت عود کر دیا اور اس طالب علم کو کالج سے بے جرم نکال دیا گیا۔ ربوہ میں یہ بات عام تھی کہ صوفی بشارت اولاد جیسی نعمت سے محروم ہونے کے باعث اپنی محرومیوں کا حساب طلباء سے لیتے تھے۔ عربی کی طالبات میں سے ایک حسن و جمال کی پرتو اپنے ایک ہم جماعت پر فریفتہ ہو گئی لیکن اس طالب علم نے اپنے کالج بدر ہم جماعت کا حوالہ

دے کر ہاتھ جوڑتے ہوئے موصوفہ سے کہا "اے دشمن عقل و آگہی! مجھے معاف ہی کرو مجھ میں قہر بشارت برداشت کرنے کی ہمت نہیں"۔

اسلامیات کے پروفیسر عثمان صدیقی، جنہیں پھلبہری کے داغوں کے باعث "بابا عالم سرخ پوش" کہا جاتا تھا گو مرزائی تھے مگر ان میں دیگر مرزائیوں جیسا حوصلہ نہیں تھا۔ ایک بار وہ سورہ یوسف پڑھا رہے تھے تو انہوں نے حضرت یوسف اور زلیخا کے بارے میں کچھ خرافات بیان کرنے کی کوشش کی جس پر میرے سمیت چند مسلمان طلبہ نے ان سے برملا کہا "جناب آپ نصابی کتب پڑھا رہے ہیں لہٰذا ان میں "اپنی جماعت" داخل نہ کریں ورنہ ہم کلاس کا بائیکاٹ کر دیں گے"۔ بس اتنی بات کہنے کی دیر تھی، صدیقی صاحب سیدھے ہو گئے۔

کالج کے تمام اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بہت کم تنخواہ ملا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں جب تعلیمی ادارے قومیائے گئے تو تمام اساتذہ کی چاندی ہو گئی۔ اکثریت کو برسوں کے بقایا جات ملے تو انہوں نے گاڑیاں لے لیں۔

کالج میں یہ قاعدہ تھا کہ ہر سال یونین کے الیکشن کرائے بغیر صدر اور سیکرٹری سمیت تمام عہدیدار پرنسپل اپنی مرضی سے منتخب کر دیا کرتے تھے۔ تعلیمی ادارے سرکاری تحویل میں جانے کے بعد ہمارے ایک سینئر طالب علم رفیق باجوہ نے اس فرسودہ روایت کو توڑنے کی کوشش کی اور یونین کا الیکشن باقاعدہ لڑنے کی مہم چلائی۔ اس وقت کالج کے پرنسپل چودھری محمد علی جبکہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد تھے۔ کالج انتظامیہ نے رفیق باجوہ کو الیکشن لڑنے سے روک دیا اور حکم عدولی کی صورت میں کالج سے تین سال کے لئے نکال دینے کی دھمکی دی۔ مگر رفیق باجوہ ڈٹ گیا اور اس نے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد سے ملاقات کر کے پرنسپل چودھری محمد علی کے نام ایک حکم جاری کروایا جس میں یونین کے انتخابات صوبے کے کالجوں میں مروجہ طریق کار کے مطابق کرانے کے لئے کہا گیا۔ لیکن یہ حکم نامہ جب پرنسپل صاحب کو ملا تو اس نے یہ کہہ کر تار تار کر دیا "ملک معراج خالد پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوں گے،

ربوہ کے نہیں۔ اس کالج پر ان کا نہیں' میرا حکم چلتا ہے"۔

رفیق باجوہ اور اس کے ساتھیوں ظہیر چٹھہ اور انور دیو نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو پرنسپل نے مرزا طاہر اور مرزا لقمان سے مدد طلب کرلی۔ خدام احمدیہ کے غنڈوں نے کالج گھیرے میں لے کر تینوں طلبہ کو پکڑنے کے لئے کالج کا کونا کونا دیکھا۔ رفیق باجوہ تو کسی طرح چنیوٹ پہنچ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا جب کہ ظہیر چٹھہ اور انور دیو پکڑے گئے' جن پر اتنا تشدد کیا گیا کہ انہوں نے دوبارہ الیکشن لڑنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ رفیق باجوہ نے بعد ازاں مرزائیت اور ربوہ چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا اور چونڈہ میں رہائش اختیار کرلی۔

پرنسپل چودھری محمد علی عجیب و غریب مزاج کے انسان تھے۔ مرزائیوں والی روایتی مکاری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ طلبہ کو پوری طرح پریشرائز کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مگر جونہی کوئی طالب علم حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیتا موصوف بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتے تھے۔ ایسے میں عموماً" ان کا ایک ہی مخصوص جملہ ہوتا جن سے طلبہ پسیج جایا کرتے تھے۔ موصوف روتے ہوئے کہتے "اچھا تو آج ایک باپ اپنی اولاد کے سامنے اس قدر بے بس ہو گیا ہے کہ اس کے آنسوؤں کی کوئی وقعت نہیں"۔ ایک استاد کو یوں روتا ہوا دیکھ کر سرکش طلبہ بھی موم ہو جاتے تھے۔

۱۹۷۳ء میں چنیوٹ میں شدید سیلاب آیا' اس سال میں نے تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا۔ ہمارے مرزائی کلاس فیلو اور بے تکلف دوست سیلاب کے حوالے سے ہمیں مذاق کرتے ہوئے کہتے کہ "دیکھ لو پورے ملک میں سیلاب آیا لیکن ربوہ خشک رہا ہے۔ اب بھی احمدیت کو مان لو اچھے رہو گے ورنہ ایک دن ایسا ہی کوئی سیلاب تم لوگوں کو لے ڈوبے گا"۔ ہم نے بھی ان کے لئے منہ توڑ اور شافی جواب تلاش کر رکھا تھا چنانچہ انہیں کہا گیا۔

"بھئی تم سچ کہتے ہو دو مقامات پر واقعی سیلاب نہیں آیا"۔

ان کے کان کھڑے ہو گئے انہوں نے پوچھا "کون سی دو جگہیں" ہم نے کہا "ایک ربوہ اور دوسرا لاہور کا بازار حسن" ان دونوں مقامات پر کوئی آسمانی عذاب ہی آئے تو آئے سیلاب ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

یہ جواب سنتے ہی اچھے اچھوں کی بولتی بند ہو گئی' وہ روایتی مرزائی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہنے لگے "یہ جو بات تم نے کہی ہے یہ انسانیت سے گری ہوئی ہے۔ تم نے ہمارے مرکز کو "قحبہ خانے" سے ملا دیا ہے"۔

ہم نے جواب دیا "بھئی بات انسانیت کی ہے تو بازار حسن کے باسی بھی انسان ہیں بلکہ تم لوگوں سے ہزار درجہ بہتر' کیونکہ انہوں نے جھوٹا نبی تو نہیں بنایا"۔

میں ۱۹۷۴ء میں فورتھ ایئر میں تھا۔ اسی سال ۲۹ مئی کا واقعہ ہوا جس کے نتیجے میں مرزائی سرکاری اور آئینی طور پر کافر قرار دیئے گئے۔ اس واقعہ کی تفصیلات مرزا طاہر کے متعلق باب میں آ چکی ہیں۔ تاہم کچھ باتیں بیان کرنی ناگزیر ہیں کہ ۲۹ مئی سے ۷ ستمبر تک چنیوٹ سے ربوہ پڑھنے کے لئے آنے والے ہم جیسے طلبہ و طالبات کو بھی بہت بڑی قربانیاں دینا پڑیں۔ ان دنوں ربوہ میں ریل اور بس نہیں ٹھہرتی تھی۔ چنانچہ ہم سب دریائے چناب کے پل پر اترتے اور وہاں سے پیدل کالج آیا کرتے تھے۔ ہم نے "شیزان" کا باقاعدہ بائیکاٹ کیا۔ ایک بار کسی مسئلے پر پرنسپل صاحب نے ہمیں اپنے آفس بلایا وہاں ہمیں شیزان پیش کی گئی مگر تمام طلبہ نے اجتماعی طور پر شیزان پینے سے انکار کر دیا۔ حکومتی فیصلہ آنے تک ہم سب نے اپنے مرزائی دوستوں اور کلاسوں سے بھی ترک تعلق کیے رکھا۔ ۷ ستمبر کو جب قومی اسمبلی میں مرزائیوں کو کافر قرار دینے کا قانون پاس کر کے ۹۰ سالہ پرانا ختم نبوت کا مسئلہ حل ہوا تو ہم لوگ فاتح بن کر ربوہ داخل ہوئے۔

اس سال ہم نے یونین کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مرزائی انتظامیہ نے مختلف طریقوں سے ہمیں الیکشن میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مسلمان طلبہ میں پھوٹ اور انتشار ڈالنے کی سازشیں کی گئیں۔ ہم لوگوں نے یہ یقین ہونے کے باوجود

کہ کالج میں مسلمان طلبہ کی تعداد کم ہے اور جیت ممکن نہیں' الیکشن لڑنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ مرزائی ہم لوگوں سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہیں ربوہ میں کوئی موزوں طالب علم امیدوار نہیں مل رہا تھا جو ہمارا مقابلہ کرتا۔ پشاور سے ایک مرزائی طالب علم اعجاز خان یوسف زئی کو مائیگریٹ کرا کے ربوہ لایا گیا جب کہ ہمارا امیدوار منیر احمد تبسم تھا۔ کالج میں پہلی بار انتخابی سرگرمیاں کھل کر ہوئیں۔ اس دوران ہم نے ایک مزاحیہ سا نعرہ تیار کیا جس کا کوئی مطلب تھا نہ مفہوم۔ ہم میں سے ایک لڑکا بلند آواز سے کہتا "لائٹ آن کیمرہ ڈاؤن ایک دو تین لوشے" اس بے معنی نعرے سے مرزائی طلبہ اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ ان کے مرکز میں بھی سر جوڑے جانے لگے کہ یہ کسی سازش کا کوئی کوڈ یا خفیہ سگنل نہ ہو۔ شہر کی دیواروں پر امیدواروں کے ناموں کی تشہیر کی گئی۔ کالج میں بینر لگائے گئے۔ کالج انتظامیہ نے ضلعی اور تحصیل انتظامیہ سے درخواست کی کہ وہ الیکشن اپنی نگرانی میں کرائے۔ اس مقصد کے لئے ربوہ کے مجسٹریٹ سردار منیر احمد لغاری کو خصوصی ٹاسک دیا گیا۔ مرزائیوں نے لغاری کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے کالج کے گیسٹ ہاؤس میں رہائش فراہم کر دی۔ الیکشن والے دن ضلع بھر کی انتظامیہ ربوہ پہنچ گئی۔ ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں خصوصی بیلٹ پیپر کے ذریعے الیکشن ہوئے۔ حسب توقع مرزائی جیت گئے۔ بعد میں اس خوف سے کہ ہم کوئی مظاہرہ نہ کریں انتظامیہ نے ہم سے تحریری ضمانت لی۔ یونین کے الیکشن ہارنے کے باوجود ہم نے کالج کی مختلف سوسائٹیوں کے الیکشن میں بھی حصہ لیا۔ میں نے ہسٹری سوسائٹی کے صدر کا انتخاب بلا مقابلہ جیتا۔ یونین کے الیکشن کی ہار کا حساب بھی ہم سے بعد آنے والی فورتھ ایئر نے ۱۹۷۵ء میں چکا دیا۔ اس سال پرنسپل سمیت بیشتر مرزائی اساتذہ تبدیل ہو چکے تھے۔ دوسرے مسلمان طلبہ نے یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ مسلمان ہیں الیکشن میں حصہ لیا۔ مگر جیتنے کے فوراً بعد انقلاب برپا کر دیا۔ کالج میں دیگر تعلیمی اداروں کی طرح اتوار کی چھٹی کرائی گئی۔ کالج کے ہال اور دیگر مقامات سے مرزائی اکابرین کی تصاویر اتروا کر قائد اعظم' علامہ اقبال اور ذوالفقار علی بھٹو کی تصاویر لگوائی گئیں۔ جلسہ

سالانہ پر کالج مرزائیوں کے تصرف میں دینے کی پرانی روش ختم کرا دی گئی۔ یونین کے مسلمان صدر ملک ظہیر اعوان برملا کہا کرتے تھے کہ "ہم نے اپنے پیش رو مسلمان طلبہ بھائیوں کی سالہا سال کی کوششوں کا ثمر پایا ہے"۔

کالج میں کیمسٹری کے پروفیسر سید سلطان محمود شاہد واحد استاد تھے' جن کی مسلمان طلبہ سے بہت بنتی تھی۔ چنانچہ جب بھی کوئی "پھڈا" پڑتا موصوف کو "پل" بننے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایم ایم احمد کے بھائی مرزا مجید احمد موجی ہسٹری کے استاد تھے۔ مگر اہل بیت کے اس قدر مخالف تھے کہ کلاس میں شیعہ طلباء کا وجود ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جب کہ سعود احمد خان انتہائی غصیلے اور روایتی قسم کے مرزائی تھے۔

فضل عمر ہوسٹل میں ہر قسم کی شراب ملتی تھی۔ کوئی مرزائی لڑکا مے نوشی کرتا ہوا پکڑا جاتا تو معاملہ دبا دیا جاتا مگر جب کوئی مسلمان لڑکا گرفت میں آ جاتا تو اس کی باقاعدہ تشہیر کی جاتی اور اسے کالج سے نکال دیا جاتا ایک بار ہمارے ایک دوست شاہد نسیم پر بھی شراب نوشی کا الزام لگایا گیا۔ اس سے قطع نظر وہ قصور وار تھا یا نہیں' اس کو باقاعدہ سزا دی گئی اور کالج چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

ہمارا دوست قمر الزمان فاروقی مسلمان طلبہ میں زبردست قسم کا مرد مجاہد تھا۔ تھیالوجی کے استاد اسلم منگلا کے ساتھ ایک بار اس نے ایسی ٹکر لی کہ منگلا سمیت پوری کالج انتظامیہ کے چھکے چھڑا دیئے۔ اسلم منگلا قرآن پاک کی تفسیر پڑھا رہا تھے۔ انہوں نے حسب عادت مرزائی خلیفہ مرزا محمود کا ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ قمر الزماں نے کھڑے ہو کر کہا۔

"سر! قرآن مجید کا جو ترجمہ آپ کر رہے ہیں وہ غلط ہے"۔ اسلم منگلا نے قمر کو بیٹھ جانے کے لئے کہا مگر اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک غیر مسلم شخص کو قرآن کا غلط ترجمہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا"۔

اسلم منگلا کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ انہوں نے کلاس چھوڑ دی اور شکایت کرنے چودھری محمد علی کے پاس جا پہنچے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مرزائی کافر قرار دیئے جا چکے تھے اور ربوہ کھلا شہر بن چکا تھا۔ پرنسپل نے فوری طور پر قمر کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور کہا۔

"قمرالزماں! تم نے اسلم منگلا سے گستاخی کی ہے لہٰذا معافی مانگو"۔

قمر نے کہا "گستاخی میں نے نہیں اسلم منگلا نے کی ہے' قرآن پاک کے معانی تبدیل کرنے کے جرم پر وہ معافی مانگیں"۔

چودھری محمد علی نے یہ جواب سنا تو گرجدار آواز میں کہا "لڑکے اپنی آواز بند کرو' تمہیں معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو"۔

قمر نے کہا " سر! آپ میری آواز بند نہیں کر سکتے' ہماری آواز کی گرج آپ سے کہیں زیادہ ہے اور اس گرج سے عورتوں کے حمل گر جایا کرتے ہیں۔ بطور استاد اسلم منگلا کا احترام لازم سہی لیکن قرآن پاک کا غلط ترجمہ کرنے والا کسی احترام کا مستحق نہیں"۔

چودھری محمد علی صاحب غصے سے کانپ رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی تھی' کچھ دیر بعد انہوں نے قمر کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں تمہیں کالج سے تین سال کے لیے نکال سکتا ہوں۔ اگر ایسا کر دیا گیا تو تمہیں کسی کالج میں داخلہ نہیں مل سکے گا"۔ قمر نے پھر بھرپور وار کیا اور کہا "سر! ہم مسلمان اور قرآن کے محافظ ہیں اگر کسی نے اس کے الفاظ و معانی میں کوئی تحریف کی تو ہم اس کی کھال اتار سکتے ہیں۔ آپ کو بھی شاید اس بات کا علم نہیں"۔ پرنسپل کے کمرے میں موجود دیگر اساتذہ نے قمر کو چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ اور بھڑک اٹھا اور کہا:

"پرنسپل صاحب! آپ اگر مجھے اس مقدس جرم کی پاداش میں کالج بدر کر دیں گے تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔ لیکن یاد رکھیں' اگر آپ کے کسی استاد نے قرآن

حکیم کے ترجمے میں کوئی تبدیلی کی تو میں آپ سمیت سب کو الٹا لٹکا دوں گا۔ آپ کو اپنے "نبی" کی نبوت' سنت اور تفاسیر پر بڑا مان ہے تو ہم بھی اپنے پیارے کالی کملی والے (ﷺ) کے غلام ہیں' ہمیں روباہی نہیں آتی"۔

پرنسپل اور اسلم منگلا دونوں چپ تھے انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ قدرے توقف کے بعد فون اٹھاتے ہوئے پرنسپل نے کہا۔

"میں پولیس کو بلاتا ہوں تاکہ وہ اس نعرے باز لڑکے کو جیل میں بند کرے"۔

قمر پھر گرجا اور کہا "بے شک بلالیں پولیس کو' دیکھتے ہیں سلاخوں کے پیچھے کون جاتا ہے میں یا آپ"۔

اب جبکہ کوئی بات کارگر ثابت نہ ہوئی تو پرنسپل نے ایس ایم شاہد کو بلوایا کہ وہ قمر کو سمجھائیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ایس ایم شاہد ہمیشہ پل کا کردار ادا کرتے تھے انہوں نے قمر کو یقین دلایا کہ آئندہ کلاس میں مرزائی تفاسیر سے کوئی ترجمہ نہیں کیا جائے گا۔ تب جا کر معاملہ ٹھنڈا ہوا۔

قمرالزماں ہمارے دوستوں میں سب سے زیادہ نڈر اور دلیر تھا۔ اس نے شورش کاشمیری کی تحریر اور تقاریر پڑھ اور سن رکھی تھیں وہ اسی انداز میں مرزائیوں کے "لتے" لیا کرتا تھا۔ اس نے ذاتی مصروفیات کی بنا پر یونین کے الیکشن میں حصہ نہیں لیا ورنہ مرزائیوں کی عقل ٹھکانے لگ جاتی۔ یونین کے الیکشن کے دوران مرزائیوں کو یہ دھڑکا ہی لگا رہا کہ قمرالزماں کہیں مسلمان طلبہ کا امیدوار نہ بن جائے۔

کالج میں ہم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی جس میں چنیوٹ کے علاوہ ہوسٹل میں مقیم تمام لڑکے شامل تھے۔ اس سوسائٹی کی غرض و غایت کالج میں مسلمان لڑکوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام اور مرزائی اساتذہ اور طلبہ کی ان باتوں پر نکتہ چینی کرنا تھی جو خلاف اسلام تھیں۔ مرزائیوں کا زور توڑنے کے لئے ہم نے اس سوسائٹی کے زیر اہتمام اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں کیں۔ پنجاب کے ایک وزیر اعلیٰ سے ہماری ملاقات بھی ہوئی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی اہلیہ

مرزائی تھیں۔ مرزائی ہماری اس سوسائٹی سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے اپنی خفیہ ایجنسیاں سرگرم کر دیں۔

سرگودھا کا ایک شخص خالد محمود اکثر و بیشتر ربوہ آتا اور وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ وہ حکومت اور غیر ملکی ایجنسیوں کی طرف سے مرزائیوں کے خلاف معلومات لینے پر مامور ہے چنانچہ اس "بد ملت" کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اسے ہمارے جیسے طلباء ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ اس شخص کی باتوں سے ماتھا تو ہمارا پہلے ہی دن ٹھنکا تھا مگر پھر بھی ہم نے کافی دن خاموشی سے کام لیا۔ ایک دن اس نے ہمیں سرگودھا بلایا ہم چھ سات لڑکوں کا گروپ سرگودھا گیا' ہم نے احتیاطاً" گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ایک دو "اولڈ طلبہ" کو بھی ساتھ لے لیا۔ نعمت کدہ ہوٹل میں پر تکلف کھانے کے بعد خیام سینما میں ہمیں فلم دکھائی گئی۔ اس شخص کے موضوع گفتگو میں یہی پہلو نمایاں ہوتا تھا کہ ہم اسے مرزائیوں کے خلاف اپنے منصوبوں سے متعلق معلومات فراہم کریں۔ اس شخص کے بارے میں جلد ہی ہمارے سرگودھا کے دوستوں نے پتہ چلا لیا کہ یہ سیالکوٹ کا رہنے والا ہے اور مرزائیوں کی کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ ہے' جو مسلمان طلبہ کو اپنا ہم نوا بنا کر ان کے عزائم کا جائزہ لینے کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ربوہ میں جماعت اسلامی تو کوئی تنظیم قائم نہیں کرنا چاہتی۔ دراصل مرزائیوں کو خدشہ تھا کہ ہماری مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جماعت اسلامی کی کوئی ذیلی تنظیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ربوہ کے مرزائی اگر کسی سے ڈرتے ہیں تو وہ جماعت اسلامی ہے۔ بعض لوگ تو طنزاً" یہ بھی کہتے ہیں کہ مرزائیوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ان کے ایک کان میں اذان دیتے ہیں اور دوسرے کان میں یہ بتاتے ہیں کہ جماعت اسلامی سے بچ کر رہنا۔ خالد محمود کے علاوہ ایک شخص جس کا نام اب بھول گیا ہے۔ اس نے بھی مسلمان طلبہ کو شیشے میں اتارنے کی بسیار کوششیں کیں مگر اس کی دال بھی نہ گل سکی۔ مرزائیوں کو کالج کی سطح پر "ناک آؤٹ" کرنے کے لئے ہماری مدد جن حلقوں نے کی ان میں چونڈا والے رفیق باجوہ قابل ذکر ہیں۔ ہم انہیں ملنے کے

لئے چونڈہ گئے انہوں نے ہمیں ربوہ کے بعض ایسے لوگوں کے حوالے دیئے جن سے مل کر مرزائیوں کی جڑیں کاٹی جا سکتی تھیں۔ ان لوگوں میں لطیف غزنوی قابل ذکر ہیں۔ یہ شخص اگرچہ مرزائی تھا تاہم اس نے ہمیں اپنی سرگرمیاں موثر بنانے کے لئے کئی راہیں بتائیں۔ کالج میں کئی کالے قوانین' جن کے ذریعے طلبہ کے گرد گھیرا تنگ کیا جاتا تھا ان کی نشاندہی کی اور ان سے بچاؤ کے گر بتائے۔

ربوہ کے تمام تعلیمی اداروں میں داخلہ لیتے وقت' محکمانہ امتحان کا داخلہ بھیجتے وقت اور رول نمبر سلپ کے اجراء کے وقت انتہائی مشکل ٹیسٹ لیے جاتے تھے۔ ان امتحانات کو پاس کرنے والوں کو کالج میں داخلہ ملتا یا ان کا داخلہ بورڈ اور یونیورسٹی کو بھیجا جاتا۔ اور بعد ازاں اس بنا پر رول نمبر جاری کیا جاتا۔ اس سے مرزائی دوہرے مقاصد حاصل کرتے تھے ایک تو کالج کی کریم کو محکمانہ امتحان میں بھیجنے اور سو فیصد نتائج حاصل کر کے اپنے تعلیمی اداروں کے عمدہ ہونے کا پرچار کرتے' دوسرے ناپسندیدہ طلبہ کو عین وقت پر رول نمبر سے محروم کر کے اس کا سال ضائع کرا دیا کرتے تھے۔ ہم نے اس کالے قانون کو جڑ سے نکال پھینکا۔ طلبہ نے پرنسپل کے ساتھ باقاعدہ "متھا" لگا کر داخلہ اور رول نمبر ٹیسٹ دینے سے انکار کر دیا۔ جس سے کئی لڑکوں کا سال ضائع ہونے سے بچ گیا۔

۱۹۷۵ء میں بی۔ اے کا امتحان دینے کے بعد ربوہ سے میرا وہ عملی رابطہ اور واسطہ ختم ہو گیا جو ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا تھا۔ تاہم کالج کو خیرباد کہنے کے بعد بھی ہماری بے شمار یادیں وہاں باقی رہیں جن میں مرزائیوں کے ان کالے قوانین کا خاتمہ شامل ہے جن کی زد میں آ کر مسلمان طلبہ کالج اور ہوسٹل میں درماندہ زندگی گزارا کرتے تھے۔

ان دنوں ربوہ کے درودیوار اور سڑکوں کے سنگ میل پر جرمن نازی ازم کا نشان "سیواس تیکا" رقم ہوتا تھا۔ اس بارے میں پتہ چلا کہ مرزائیوں کی نازی تنظیم سے بھی وابستگی ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں اخبارات میں شور مچایا تو یہ نشان کسی در پردہ قوت نے صاف کر دیئے۔

قرآن کریم کے لفظ "ربوہ" کا تحقیقی مطالعہ

حال ہی میں پنجاب اسمبلی نے "ربوہ" کا نام تبدیل کرنے کی ایک قرارداد پاس کی ہے جس پر قادیانی امت کے تمام حالات سے واقف ترجمان راجہ غالب احمد برادر راجہ منور احمد نے بہت کسمساتے ہوئے کہا ہے کہ اگر شہروں کے نام تبدیل کرنے کا یہ سلسلہ چل نکلا تو پھر رکے گا نہیں۔ ذیل کا علمی و تحقیقی مضمون اس سلسلے میں قارئین کے لئے مفید اور سودمند ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قادیانی امت نے یہ نام اپنی روایتی تلبیس سے کام لیتے ہوئے محض اپنی معاشی اور روحانی دکان چمکانے اور عام مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے رکھا ہے اس لئے اس کا تبدیل کرنا ناگزیر ضرورت ہے۔

نحمده و نصلي و نسلم على رسوله الكريم

بسم الله الرحمن الرحيم و بعد

قرآن مجید میں ربوہ کا لفظ دو دفعہ استعمال ہوا ہے۔

(۱) **كمثل جنة بربوة** (سورہ البقرہ ۲۶۵)

(۲) **و آوينا هما الى ربوة ذات قرار و معين** (سورہ المومنون ۵)

۱۔ لفظی ترجمہ

جو سطح زمین سے بلند جگہ پر ہو اور دوسری آیت میں "عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو ایک ٹیلہ پر ٹھکانہ دیا۔ اس لفظ کا اصل مادہ "ر ب و" ہے۔ جو کہ قرآن مجید میں مختلف جگہوں میں مختلف **شکلوں** کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ ان تین حروف کو جب یکجا کریں تو یہ لفظ "ربوا" کی شکل اختیار کر جاتا ہے، جس کا قرآن مجید میں اس

طرح ذکر ہوا ہے

احل اللہ البیع و حرم الربوا (سورہ البقرہ ۲۷۵)

یعنی اللہ نے خرید و فروخت کو جائز کیا ہے جب کہ سود کو حرام کیا ہے۔ یہ دراصل ہر زیادتی کا نام ہے۔ پھر اس زیادتی پر جب مزید زیادتی ہوتی ہے تو اس میں سختی کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ تو اس پیرائے کی تعبیر کے لئے قرآن مجید نے لفظ رابیہ استعمال کیا ہے۔

فاخذھم اخذۃ رابیۃ (الحاقہ ۱۰)

ہم نے انہیں انتہائی سخت طرح پکڑ لیا۔ یہ رابیہ بھی رب و سے ہی ماخوذ ہے۔ اس کے مصدر کا فعل مضارع یربو اور یربی دونوں طرح قرآن مجید میں مستعمل ہیں۔

ربوہ لفظ کی قرات تین طرح کی جاتی ہے۔ عام مشہور قرات "ربوہ" ہے جب کہ "رُبُوہ" اور "ربوہ" بھی ہے۔ پہلی دو قراتوں کا ذکر لسان العرب نے کیا ہے۔ (لسان العرب' مادہ ربا) جبکہ تیسری قرات کا ذکر امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں (مفردات القرآن مادہ رب و) امام راغب نے اس کا تلفظ "رباوۃ) بھی پڑھا جانا ذکر کیا ہے۔ جبکہ لسان العرب نے "ربوہ" پڑھنے کو ترجیح دی ہے اور ربوہ پڑھنا بنو تمیم کی لغت قرار دیا ہے۔ اور اس کی جمع رب ی اور ربی بتلائی ہے۔ لسان العرب نے "ربوہ" پڑھنے کو شاید اس لئے راجح قرار دیا ہے کہ اہل عرب اپنی عام محاوراتی زبان میں کہتے ہیں **مرت بنا ربوہ من الناس (وہی الجماعۃ العظیم نحو عشرۃ الاف)** یعنی لوگوں کی ایک بڑی جماعت کا ہم سے گزر ہوا (جس سے مراد تقریبا" دس ہزار اور اسی طرح رباوۃ کا استعمال بھی اہل عرب اتنی زبان میں اس طرح کرتے ہیں **فلاں فی رباوۃ قومہ** یعنی اس کا شمار اپنی قوم کے معزز لوگوں سے ہے (اساس البلاغتہ مادہ رب و) لسان العرب میں مزید اس مادہ کا ماضی فعل مضارع اور مصدر اور اس کی توضیح اس طرح کی گئی۔

ربا الشئی یربو ربوا ورباء

بمعنی زاد و نما یعنی کسی چیز کا بڑھنا اس کا مضارع یربوا اور مصدر ربوا اور رباہ بمعنی

زیادہ ہونا اور پڑھنا اور اس سے ثلاثی مزید فیہ اربیتہ غیتہ کہ میں نے اس کو زیادہ کیا اور پڑھایا قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ **یربی الصدقات** یعنی صدقات میں اضافہ کرتے ہیں اور حدیث صدقہ میں یوں مذکور ہے۔ **تربوا فی کف الرحمن حتی تکون اعظم من الجبل** کہ صدقہ رحمٰن کے ہاتھوں میں بڑھ بڑھ کر پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ اور عام محاورہ میں کہتے ہیں ربا السویق یعنی ستو میں جب پانی ڈالا جاتا ہے تو وہ پھول جاتا ہے اس کے لئے یہ محاورہ بولا جاتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں زمین کی جو صفت بیان ہوئی ہے۔ مثلا **اھتزت و ربت ای عظمت و انتفخت** یعنی زمین پھول کر پھٹ پڑی۔ حدیث شریف میں ہے یہ لفظ اس طرح وارد ہے۔ **الفردوس ربوۃ الجنۃ ای ارفعھا** یعنی فردوس جنت کی اونچی جگہ ہے باقی جنتوں کے مقابلہ میں (لسان العرب مادہ ر ب و) ربوہ اور ربوہ کے فرق کو اکثر لغات نے تو واضح نہیں کیا۔ جبکہ ابن کثیر نے اس کتاب النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں یہ فرق کیا ہے۔ **الربوہ بالضم و الفتح و الضم ما ارتفع من الارض**۔ یعنی ربوہ مضموم اور مفتوح دونوں طرح مگر اگر مضموم ہو تو اس کا معنی سطح زمین سے اونچی زمین۔ باقی اگر بالفتح ہو تو یہ زبانی کے معنی میں ہو گا۔ جیسا حدیث **طھفۃ** کے حوالے سے مذکور ہے **من ابی فعلیہ الربوہ** یعنی جو زکوٰۃ کا انکاری ہو تو اس سے اصل زکوٰۃ کی رقم سے زائد وصول کیا جائے گا۔ اور اس طرح **من اقربالجزیہ فعلیہ الربوہ** یعنی جو اسلام اس لئے قبول نہیں کرتا کہ اس میں آکر زکوٰۃ دینی پڑے گی تو اس کے اصل جزیہ کی رقم سے زائد جزیہ لیا جائے گا۔ (النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ج ۲ ص ۱۹۲) اس فرق سے تو یہ قول راجح ٹھہرا کہ قرآن مجید نے جن دو جگھوں میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اسے "ربوہ" پڑھنا اولی ہے۔ جیسا کہ صاحب لسان العرب کی ترجیح ہے۔ المعجم المفہرس للالفاظ الحدیث کے حوالہ سے ترمذی میں سورۃ المومنون کی تفسیر میں اس لفظ کے ذیل میں لکھا ہے۔ **الفردوس ربوۃ الجنۃ و اوسطھا و افضلھا**۔ یعنی فردوس یہ جنت کا ربوہ (اونچی جگہ) اور جنت کا بہترین مقام ہے۔ اور

مسند احمد میں منقول ہے۔ **الا ان عمل الجنة حزن بربوہ۔** (مسند احمد ص ۳۲۷ و ج ۳ ص ۳۶۰)

۲- روایتی تجزیہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم علیہما السلام کو جس جگہ ٹھکانہ دیا اس کو ربوہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر موضح القرآن حاشیہ میں نقل فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب ماں سے پیدا ہوئے تو اس وقت کے بادشاہ نے نجومیوں سے سنا کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ پیدا ہوا ہے۔ وہ ان کی تلاش میں پڑا' ان کو بشارت ہوئی کہ اس کے ملک سے نکل جاؤ۔ وہ نکل کر مصر کے ملک گئے۔ وہ گاؤں تھا ٹیلے پر اور پانی وہاں کا خوب تھا۔ (شاہ عبدالقادر۔ ترجمہ قرآن مجید ص ۵۷۱ تاج کمپنی)

(۲) تفسیر جلالین نے بھی اسی نقطہ سے اتفاق کیا ہے۔

ذکر فی سبب هذا الایواء ان ملک ذلک الزمان عزم علیٰ قتل عیسیٰ

یعنی اس کے ٹھہراؤ کے سبب کے بیان میں کہ اس زمانے کے بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کو قتل کرنا چاہا۔ (تفسیر جلالین کلاں حاشیہ ص ۲۹۰ مطبوعہ نور محمد کراچی)

(۳) تفسیر مظہری کا بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہودی بادشاہ ہیرودوس جب حضرت عیسیٰ کے قتل کے درپے ہو گیا تھا تو حضرت مریم بچہ کو لے کر مصر چلی گئی تھیں۔ (تفسیر مظہری ج ۸ ص ۱۹۱)

(۴) تفہیم القرآن میں ہیرودوس کے بعد ارخلاؤس کے عہد حکومت کا ذکر ہے۔ کہ ان کی والدہ کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی (بحوالہ متی ۲ ۱۳ تا ۲۲) تفہیم القرآن ج ۳ ص ۲۸۱)

(۵) تفسیر حسینی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ رملہ فلسطین ہے انہوں نے کشاف کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رملہ

فلسطین یہ ربوہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ٹھہرے۔ (قلمی نسخہ تفسیر حسینی ص ٦٦ ج ٣)

رملہ کا واحد الرمل ہے۔ فلسطین کا بہت بڑا شہر ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی رہ چکی ہے۔ (معجم البلدان ج ٣ ص ٦٩)

(٦) قلمی تفسیر۔ قرآن القرآن بالبیان مولفہ کلیم الدین نوراللہ ١١٢٧ھ کے حوالہ سے ربوہ، ارض مرتفعہ وہی بیت المقدس او دمش او ایلیہ فلسطین او مصر) یعنی ربوہ یہ اونچی زمین کو کہتے ہیں یہ یا تو بیت المقدس یا دمشق یا ایلیا فلسطین یا مصر ہے۔ (تفسیر مذکور کا صفحہ ٢٢٣) ایلیاء کے متعلق معجم البلدان میں مذکور ہے کہ اسم مدینہ بیت المقدس کہ یہ بیت المقدس کے کسی شہر کا نام ہے (معجم البلدان ص ٢٩٣ ج ١) دمشق کے وضاحتی نوٹ میں صاحب معجم البلدان آیت **و آوینا ھما** نقل کر کے لکھتے ہیں کہ وہی دمشق ذات قرار و معین و ذات رفاء من العیش یعنی یہ دمشق ہے کہ جو زندگی کی نعمتوں سے مالامال ہے، پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ **ان عیسی ینزل عند المنارہ البیضاء من شرقی دمشق** کہ عیسیٰ علیہ السلام کہ دمشق کے شرقی سفید مینار پر نزول فرمائیں گے۔ اور **و المغارۃ التی فی جبل الیثرب یقال انھا کان ماوی عیسی علیہ السلام** اور جبل یثرب کی جو غار ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کی جائے پناہ تھی۔ (معجم البلدان ج ٣ ص ٤٦٤) اسی طرح اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں دمشق کے وضاحتی نوٹ کے سلسلہ میں مذکور ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ (یہاں) ایک پر سکون ٹیلہ (ربوہ) پر قیام فرمائے ہوئے تھے۔ (الی ربوہ ذات قرار ٢٣: (المومنون ٥٠) اور دنیا کے خاتمے کے قریب دجال سے لڑنے کے لئے سفید مینار پر جسے کبھی تو مشرق مینار قرار دیا جاتا تھا اور کبھی مسجد جامع کا شرقی مینار نزول اجلال فرمائیں گے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ٩ ص ٤٠٣ مادہ (دمشق)

(٧) مولانا ابوالکلام، ترجمان القرآن میں اس آیت کے زیر حاشیہ تحریر کرتے ہیں ہم نے انہیں ایک مرتفع مقام پر پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھی۔ غالباً" اس

سے مقصود وادی نیل کی بالائی سطح ہے یعنی مصر کا بالائی حصہ- اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد مریم (ترجمان القرآن ج۲ ص ۵۳ مطبوعہ اسلامی اکلومی)

(۸) امام قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں تحریر کیا ہے کہ ابوہریرہ کے ایک قول بموجب فلسطین اور رملہ ہے اور نبی علیہ السلام سے بھی مروی ہے- نیز ابن عباس، ابن المسیب اور ابن سلام کے نزدیک یہ دمشق ہے- کعب اور قتادہ کے نزدیک بیت المقدس اور ابن زید کے نزدیک مصر (الجامع الاحکام القرآن ج ۱۲ ص ۱۲۶ مطبوعہ ایران)

(۹) البدایہ و النہایہ میں ضحاک عن ابن عباس روایت کرتے ہیں یہود کے خطرہ کے بموجب اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ کی طرف وحی کی کہ انہیں مصر کی طرف لے کر چلی جائے- اور قرآن مجید میں و جعلنا ابن مریم و امہ ------- میں اس طرف اشارہ کر دیا ہے- (البدایہ ج ۲ ص ۷)

(۱۰) تفسیر حسینی کے قلمی نسخہ میں ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے "آوردہ اند کہ مریم با پسر عم خود یوسف بن ماثان دوازدہ سال در آن موضع بسر کردند" یعنی حضرت مریم اپنے لڑکے اور یوسف بن ماثان اپنے چچا کے صاحبزادہ کے ہمراہ ۱۲ سال اس جگہ پر رہے- (تفسیر حسینی قلمی ص ۴۶۰ محفوظ کتب خانہ جامعہ عربیہ چنیوٹ ضلع جھنگ)

(۱۱) جلالین نے تفسیر صاوی کے حوالہ سے یہی بات نقل کی ہے کہ آپ کی والدہ اس ٹیلہ پر لے گئیں اور یہاں ۱۲ سال رہیں اتنے میں وہ بادشاہ مر گیا- (جلالین کلاں حاشیہ ص ۲۹۰)

(۱۲) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی قصص القرآن میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات پر تبصرہ فرماتے ہیں انہوں نے حضرت عیسیٰ کی جائے ولادت کی جگہ کو ٹیلہ (ربوہ) سے تعبیر کیا ہے- اور یہ وہ جگہ ہے کہ آپ کی والدہ پیدائش کے قریب بیت المقدس سے دور تقریباً ۹ میل دکوہ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے- (قصص القرآن ج ۴ ص ۴۲) بیت اللحم

کے متعلق صاحب معجم البلدان نے یہ توضیح کی ہے۔ بیت المقدس کے آس پاس ایک پر رونق جگہ ہے۔ یہاں ایک جگہ مہد عیسیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کا محل وقوع بیت المقدس سے جبرین کی طرف ہے۔ جبرین بیت المقدس اور عسقلان کے درمیان ایک قلعہ ہے۔ اس کو عمرو بن العاص نے فتح کیا تھا اور اس کو اپنی جاگیر میں شامل فرمالیا۔ اس کا نام غلام کے نام پر عجلان رکھا۔ اور ایک روایت کے مطابق بیت اللحم دمشق اور بعلبک کے درمیان ایک بستی کا نام ہے۔ (معجم البلدان ص ۱۰۲ ج ۲) اسی ساعیر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ظہور کی پیشین گوئی سابقہ آسمانی کتابوں میں ہوئی۔ چنانچہ قصص القرآن میں مذکور ہے۔ تورات انجیل اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے۔ جو مسیح علیہ السلام کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ تورات استثناء میں ہے اور اس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب ۳۳ آیت ۱۰) اس بشارت میں سینائے خدا کی آمد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور ساعیر سے طلوع ہونا نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے۔ کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام بیت اللحم میں ہوئی اور متی کی انجیل میں ہے۔ جب یسوع ہیرودس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت اللحم میں پیدا ہوا۔ (باب ۳ آیات ۲۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین ہے جسے الی ربوۃ ذات قرار و معین کہا گیا ہے۔

(۱۳) ابن کثیر نے تفسیر میں لفظ معین کی تشریح میں لکھا ہے کہ معین سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اس نہر کا ذکر ہے جس کو آیت **قد جعل ربک تحتک سریا** میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ضحاک اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ کہ **الی ربوۃ ذات قرار و معین** سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ (قصص القرآن ص ۴۶ ج ۴۴)

(۱۴) جامعہ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ کے نامور مفسر قرآن محمد علی الصابونی نے اپنی

تفسیر صفوۃ التفاسیر میں آیت و آویناھما کے تحت ابن کثیر سے موافقت کی ہے وہ کہتے ہیں **ای وجعلنا منزلھما وما واھما الی مکان مرتفع من ارض بیت المقدس** (صفوۃ التفاسیر ص ۳۱۰ ج ۲) یعنی ان دونوں کی جائے رہائش اور ان کا ٹھکانہ بیت المقدس کی اونچی زمین پر بتائی۔ اور **ذات قرار و معین ای مستویتہ یستقر علیھا و ما جاء ظاھرا للعیون قال الرازی ' القرار' المستقر کل ارض مستوبہ مبسوطۃ والمعین' الماء الظاھر الجاری علی الارض و عن قتادہ ذات ثمار و ماء یعنی انہ لاجل الثمار یستقر فیھا ساکنوہ۔** یعنی ذات قرار و معین سے مراد ہموار زمین اور پانی کا چل چلاؤ آنکھوں سے دکھائی دے رہا ہو۔ امام رازی کے حوالہ سے قرار سے مراد ہموار زمین ہے۔ اور معین سے مراد زمین پر چلتا ہوا پانی قتادہ کے نزدیک پانی کے ساتھ پھیلی ہوئی۔ کیونکہ پانی اور پھلوں کی وجہ سے لوگوں کا وہاں رہائش پذیر رہنا ممکن ہو گا۔ (صفوۃ التفاسیر سابقہ حوالہ)

روایت تطبیق

اس توضیح نے تو ماں بیٹے (یعنی عیسیٰ اور ان کی والدہ) کی رہائش گاہ اور ٹھکانے کو ایک سبز و شاداب جگہ کو قرار دیا ہے۔ جہاں زندگی کی ضروریات خوب ہوں اور جنت نظیر جگہ ہو۔ صاحب معجم البلدان اس کو دمشق قرار دیتے ہیں (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) بیت اللحم دمشق اور بعلبک کے درمیان واقع ہے اگر آپ کی پیدائش بیت اللحم میں ہوئی ہو تو دمشق سے ملحقہ ہونے کی وجہ سے اس کو دمشق کہہ دیا جائے تو عین ممکن ہے پھر صاحب معجم البلدان کے بقول کہ بیت المقدس کے آس پاس ایک جگہ "مہد عیسیٰ" سے مشہور ہے۔ اس جگہ کو اگر دمشق میں شامل کر لیا جائے تو یہ عین ممکن ہے۔ اور چونکہ حضرت عیسیٰ کو دمشق سے خاصی مناسبت ہے کہ قرب قیامت وہ دمشق کی جامع مسجد کے شرقی مینارہ پر نزول فرمائیں گے۔ تو اس مناسبت سے آپ کی پیدائش جو کہ بیت المقدس کے قریب کوہ ساعیر پر دمشق کا اطلاق کر دیا جائے

تو یہ بھی خلاف قیاس نہیں۔ چونکہ قرآن پاک نے خود اس کو مطلق چھوڑا ہے مقید نہیں کیا اس لئے اس کو ایک جگہ سے مقید تو نہیں کیا جا سکتا۔ اب ربوہ سے مراد روایات کی روشنی میں حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش کو لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگلے زمانہ کے تغیرات کے بموجب آپ نے جو مختلف جگہوں پر سکونت اختیار کی ہو تو یہ معجزاتی رنگت اختیار نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے جس خصوصیت سے بطور انجام جس جز کا آیت شریفہ میں بیان کیا وہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ حمل سے لے کر زمانہ ولادت تک کے واقعات کا احاطہ اور بحفاظت دنیا پر ظہور پذیر ہونا ہے۔ اس مذکور بالا قول کی تائید مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانی کے تفسیری وضاحتی نوٹ سے ہوتی ہے جو انہوں نے آیت آیت **الی ربوۃ ذات قرار و معین** کے زیر فائدہ نمبر ۱۲ تفسیر کے حاشیہ میں تحریر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں شاید یہ وہی ٹیلہ یا اونچی زمین ہو جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریم تشریف رکھتی تھیں۔ چنانچہ سورہ مریم کی آیت **فنادٰھا من تحتھا** دلالت کرتی ہے کہ وہ بلند جگہ تھی نیچے چشمہ یا نہر بہہ رہی تھی۔ اور کھجور کا درخت نزدیک تھا لیکن عموماً" مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے بچپن کا (پھر ہیرودس وغیرہ کا واقعہ نقل کیا) مزید آگے لکھتے ہیں۔ بعض نے ربوہ (اونچی جگہ) سے مراد شام یا فلسطین لیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلہ پر ولادت کے وقت موجود تھیں وہیں اس خطرہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو۔ (تفسیر عثمانی ص ۴۴۵۹ حاشیہ فائدہ نمبر ۱۲)

اس جائے ولادت کی تصویر کشی کرتے ہوئے ابن بطوطہ کے حوالہ سے دائرہ معارف بستانی نے ربوہ Rabwah عنوان کے تحت یہ عندیہ دیا ہے "جبل فاس کے آخر پر حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ کی رہائش گاہ کی جگہ ہے۔ اور یہ جگہ دنیا کی تمام حسین جگہوں سے زیادہ حسین سیرگاہ ہے۔ اس میں خوبصورت پختہ محلات عمارتیں اور عجیب و غریب باغات ہیں اور حضرت عیسیٰ کی رہائش گاہ کی جگہ اس میں ایک چھوٹی غار نما جگہ ہے۔ اس کے سامنے حضرت خضر کا مصلی ہے پھر مزید یاقوت

حموی کے حوالہ سے آبی گزرگاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ یہ جگہ شمالی دمشق جبل فاس کے پہلو میں ہے۔ اس کے نیچے پردی دریا بہتا ہے اور یہ جگہ ایک اونچی مسجد کی شکل میں دریا ثوری پر ہے۔ اس جگہ سے اوپر دریاء یزید گزرتا ہے۔ اس کا پانی مسجد کے حوض میں گرتا ہے اس مسجد کے ایک کونہ میں ایک چھوٹی غار نما جگہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس کا آیت **الی ربوہ ذات قرار و معین** میں ذکر ہے۔ (دائر معارف بستانی ج ۸ ص ۵۳۸ مادہ ربوہ دارالمعرفہ بیروت) نیز صاحب معجم البلدان یاقوت بن عبداللہ الحموی جس کا حوالہ بھی گزرا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دمشق ہے۔ دمشق کے پہاڑ کے دامن میں دنیا کی جنت نظیر جگہ ہے۔ اس کے نیچے دریا بردی ہے۔ یہ دریا ثوری پر ایک تاریخی مسجد کی شکل میں تعمیرشدہ ہے۔ اس کے اوپر دریا یزید بہتا ہے۔ جس کا پانی اس مسجد کے حوض میں گرتا ہے۔ اس مسجد کے ایک پہلو میں ایک گھاٹی سی غار نما جگہ ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی ہے۔ جس کا قرآن مجید میں اس آیت کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ (معجم البلدان ج ۳ ص ۲۹ دار صادر بیروت)

نہر بردی یا رودیا بردی یہ دمشق کا سب سے بڑا مشہور دریا ہے۔ دمشق سے کوئی پانچ میل دور قنوا نامی جگہ سے .علبک کے نزدیک چشموں کے پانیوں سے بنتا ہے۔ اس کا کچھ پانی نہر یزید یا دریا یزید میں چلا جاتا ہے اسی طرح جب یہ دریا دمر نامی بستی کے پاس پہنچتا ہے تو اس کا پانی پھر تین حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ یعنی دریا بردی کے شمال میں ثوری نامی دریا اور مغربی جانب باناس نامی دریا میں (معجم البلدان ج ۱ ص ۳۷۸) دریاؤں آبشاروں چشموں سرسبز شاداب مقامات کی بہتات یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی جنم بھومی قرار پاتی ہے۔

ربوہ کا تحریفی پہلو

ربوہ کا لفظ ہمیں دمشق سے پاکستان کے ضلع جھنگ تحصیل چنیوٹ کے قدیمی گاؤں "ڈھگیاں" جو کہ دریائے چناب کے شمالی کنارہ پر فیصل آباد سرگودھا روڈ پر واقع لے جاتا ہے۔ اس گاؤں کو آج "ربوہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب کہ اس کا اصلی نام کاغذات مال میں بدستور "ڈھگیاں" (چک ڈھگیاں) چلا آ رہا ہے۔ اصلی نام کی جگہ یہ نقلی نام کی تبدیلی پاکستان بننے کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ جب گورنر موڈی نے اس چک کی زمین ۹۰ سالہ ٹھیکہ پر انجمن احمدیہ کو دی۔ تو قادیانی جماعت کے وڈیروں نے اس چک کا نام اپنی مذہبی مناسبت سے "ربوہ" رکھا۔ قرآنی لفظ کا بے جا استعمال تحریف قرآن کے زمرے میں آتا ہے۔ جو کہ کفر کی ناپاک سازش ہے جو کہ کفر کا وطیرہ چلا آتا ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جہاں انہوں نے اپنی تفسیر میں (جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) آیت **الی ربوۃ ذات قرار معین** کے معنی قادیانی نظریہ کشمیر کی تردید کی ہے۔ کہ ربوہ سے مراد کشمیر ہے۔ وہ اس ربوہ کی بھی تردید کرتے چونکہ یہ ربوہ بعد میں بنا جب وہ دنیا سے جا چکے تھے۔ لہٰذا انہیں تردید کا موقع نہ ملا۔

(ب) ربوہ سے مراد کشمیر

مرزا بشیرالدین محمود اپنے قرآنی ترجمہ بعنوان تفسیر صغیر میں آیت و آوینٰھما کے تحت کیا ہے کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ اونچی جگہ کشمیر تھی بائبل یہودیوں اور ہندوؤں کی تاریخ سے بہت سے حوالے اس کی تائید میں ملتے ہیں۔ قادیانی وڈیرے مرزا بشیرالدین کو مسلمانوں کی تاریخ سے کوئی حوالہ تو نہ مل سکا البتہ کندھم جنس باہم جنس پرواز کے مصداق اپنی کفار برادری سے اس کے تائیدی حوالے ملے۔ پھر دیانت داری یہ کہ ایک حوالہ بھی تحریر میں نہ لا سکے۔ اس طرح قرآنی ترجمہ نگار مولوی محمد علی نے

بھی اس آیت کے ذیل میں اپنی کتاب "بیان القرآن" میں مسلم مورخین مفسرین اور ترجمہ اور تفسیر نگاروں کی جملہ آراء کو جھٹک کر رکھ دیا اور اپنے کشمیر کے نظریے کو پیش کرنے میں سعی لاحاصل کی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کتاب مذکورہ پر اس کا وضاحتی نوٹ (بیان القرآن ص ۹۴۵) کشمیر تو پرانی تحقیق ہے۔ اب ربوہ نام کی بستی پاکستان ضلع جھنگ کے نقشہ میں موجود ہے۔ تو اس کا مصداق قادیانیت کی نگاہ میں یہی وہ ربوہ ہے جو آیت میں مذکور ہے۔ اگر قادیانیت کو غیر مسلم قرار دینا ضروری تھا تو اس قرآنی اصطلاح اور لفظ کا تقدس اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کو بھی تبدیل ہونا چاہئے۔ اور اس کی جگہ چک ڈھگیاں اصل نام زبان خلق ہونا چاہئے۔ کفر اور مشعر با لکفر دونوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ مسلمان علماء میں سے حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی دامت برکاتہم نے اس سلسلہ میں کافی کوشش کی ہے کہ اس (ربوہ) نام کو تبدیل کیا جائے۔ اور اس کا غیر سرکاری نام صدیق آباد تجویز کیا جسے بلدیہ ربوہ نے اپنے ایک بل کے ذریعے اس تبدیلی کو پاس کرلیا ہے۔ مگر ہنوز عمل در آمد نہیں ہوا۔

حاصل بحث

بحث کا حاصل یہ ہوا کہ واقعات اور حقائق کے تناظر میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی جگہ "بیت اللحم" ہے اور یہ جگہ ایک ٹیلہ ہے جیسا کہ الموسوعۃ الذھبیہ میں مذکور ہے۔ وہی تقع علی تلال تکتنفہا مزارع الکروم والزیتون۔ یعنی یہ ٹیلہ ہے جس کے گردا گرد زیتون اور انگور کے کھیت ہیں اور اس کتاب میں بیت اللحم کی تعریف میں ذکر کیا ہے۔ **و ھی لیست بعیدۃ عن مدینۃ القدس لیست فی بیت اللحم سوی شارع واحد طویل یقود الی کنیسۃ المیلاد التی شیدت فی المکان الذی یعتقد ان المسیح ولد فیہ** یعنی بیت اللحم Bythlehem قدس شہر سے زیادہ دور نہیں اور اس میں صرف ایک لمبی سڑک ہے۔ جو کہ میلاد نامی گرجا کی طرف جاتی تھی۔ جو اس جگہ تعمیر شدہ ہے جہاں عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کی پیدائش

ہوئی۔ (الموسوعہ الذمیتہ ج ۳ ص ۲۳۲) اسی طرح مفسرین نے آیت **فحملته فانتبذت به مكانا قصيا** (مریم: ۲۲) یعنی حضرت عیسیٰ کی والدہ انہیں بوقت پیدائش ایک دور جگہ پر لے گئیں۔ کی نشان دہی بیت اللحم کی طرف کی ہے۔ جیسا کہ علامہ طنطاوی کا قول ہے **بعيدا عن اهلها اى اقصى الوادى و هو بيت اللحم** یعنی اپنے گھر والوں سے دور وادی کے آخر یعنی بیت اللحم میں (الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم للطنطاوی ج ۱۰ ص ۸) بیت اللحم کی پہلے ہم معجم البلدان کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں کہ یہ دمشق اور بعلبک کے درمیان ہے یا بیت المقدس سے جبرین کی طرف ہے۔ یہ علاقہ فلسطین کا ہے۔ جیسا کہ مقبوضہ فلسطین کے اس جغرافیائی نقشہ سے واضح ہے۔ ذرا نقشہ ملاحظہ ہو۔ اس نقشہ کی رو سے جہاں مفسرین نے فلسطین رملہ، فلسطین بیت المقدس اور مصر کے اقوال درج کیے ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں یعنی اس سارے علاقہ پر فلسطین کی چھاپ ہے اور اس کے اندر یہ سب علاقے آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دمشق بھی اس نقشہ میں شامل ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کی رہائش شہر ناصرہ بھی اس میں ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کو المسیح الناصری کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اب تمام احتمالات اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں باقی غیر مسلم قرآنی ترجمہ نگاروں نے جو "ربوہ" اس صفاتی نام سے کشمیر کا قول کیا ہے حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ اور اس صفاتی نام سے کسی شہر کا حقیقی نام رکھنا یہ تحریف قرآنی کا ایک عملی ثبوت ہے۔ جو کہ غیر مسلم کا داؤ پیچ ہے۔ جو متشابہ آیات سے اپنی تاویل باطل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے وکلمتہ القاہا الی مریم و روح منہ سے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کا دعویٰ کیا اور ان کی خدائیت کا قائل رہا۔ اور محکم آیت **ان هو الا عبد انعمنا عليه** کہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہیں اور رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم قادیانی فرقہ نے ربوہ کے محکم معانی میں تشابہ پیدا کرنے کے لئے اس صفاتی نام کا اپنی بستی پر اطلاق کر دیا اس کو محض حادثاتی واقعہ یا ترکاتی نام قرار نہیں دیا سکتا۔ بلکہ عمداً" قصداً" انہوں نے ایسا کیا ہے تاکہ اس جھوٹے مسیح موعود

(غلام احمد قادیانی) کو اس سچے مسیح موعود کے بالمقابل لایا جائے۔ پس قرآن مجید کا یہ دعویٰ **فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ** (آل عمران: ۷) کیسے فٹ نظر آتا ہے۔ کہ جن دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ کی من پسند تاویل سے پیوستہ رہتے ہیں۔ تاکہ لوگ شک و شبہ کا شکار ہوں اور ان کی باطل تاویل کا راستہ ہموار ہو جائے۔

ڈاکٹر سید محمد اعزازالحسن شاہ
بشکریہ ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان